قتیل اور غالب
تالیف
سید اسد علی انوری
تعارف
ڈاکٹر اسلم فرخی

قتیل اور غالب

تالیف

سید اسد علی انوری

تعارف

ڈاکٹر اسلم فرخی

فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اردو بازار ۔ کراچی

Qateel Aur Ghalib
by
Asad Ali Anwari

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

پیشکش و اہتمام

طارق رحمٰن فضلی

اشاعت اول : 1939ء

اشاعت دوم : 1998ء

ناشر و طابع

فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اردو بازار ۔ کراچی

تقسیم کار

فضلی بک سپر مارکیٹ

۴ ماما پارسی بلڈنگ اردو بازار کراچی

Phones: 2629720-5 Fax: 9221-2633887
Email: fazlee@cyber.net.pk

غالب شناسی کا ایک زاویہ

ڈاکٹر اسلم فرخی

ساری زندگی خود کو "عندلیب گلشن نا آفریدہ" لکھنے اور سمجھنے والے مرزا غالب کو اس "گلشن آفریدہ" میں جو محبت، شہرت اور عظمت حاصل ہوئی اس کی حیثیت مثالی ہے۔ محبت ایسی کہ گزشتہ ڈیڑھ سو برس سے وہ لوگوں کے ذہنوں اور دلوں پر راج کر رہے ہیں۔ شہرت اتنی اور ایسی کہ ان کی زندگی میں ان کے دیوانِ اردو کے پانچ مختلف ایڈیشن ۱۸۴۱ء ۱۸۴۷ء ۱۸۶۱ء ۱۸۶۲ء اور ۱۸۶۳ء میں شایع ہوئے اور پھر جو سلسلہ شروع ہوا تو آج تک جاری ہے۔ نسخہ حمیدیہ، نسخہ جرمنی، نسخہ عرشی، نسخہ شیرانی، مرقع چغتائی، نقش چغتائی، تاج ایڈیشن اور نجانے کون کون سے ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں۔ کلیاتِ فارسی بھی ان کی زندگی میں دو مرتبہ ۱۸۴۵ء اور ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا۔ پنج آہنگ دو مرتبہ اور دستنبو بھی دو مرتبہ شائع ہوئی۔ ان اشاعتوں سے غالب کی شہرت اور اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ عظمت کا یہ حال کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے ان کے دیوان کو ہندوستان کی الہامی کتابوں میں شمار کیا ہے۔

غالب کے آثار و افکار کے حوالے سے مولانا حالی نے اب سے سو برس پہلے یادگار غالب مرتب کی اور ان کی شخصیت اور کردار کے بارے میں ایک مستند دستاویز فراہم کردی۔ بیسویں صدی میں یہ کام اور آگے بڑھا۔ مولانا غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام اور مالک رام نے اپنی تحقیقی دید و دریافت سے غالب کی زندگی کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا اور انھیں ایک زندہ انسان کی حیثیت سے ہماری ادبی زندگی کا جزو بنادیا۔

تفہیم غالب کے سلسلے میں ان کے اردو کلام کی متعدد شرحیں شائع ہوئیں۔ شارحین میں علامہ نظم طباطبائی، مولانا حسرت موہانی، استاد بیخود دہلوی، شوکت میرٹھی اور مولانا سہا بھوپالی جیسے بزرگوں کے نام ملتے ہیں۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے فارسی غزلیات کی شرح مرتب کی۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور پروفیسر رالف رسل نے ان کے اشعار کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

مکاتیب غالب کا پہلا مجموعہ "عودِ ہندی" ۱۸۶۸ء میں شایع ہوا۔ اردوئے معلی کی اشاعت اس

کے بعد ہوئی اور پھر مرزا کے مزید مکاتیب بڑی تلاش و جستجو سے یکجا کئے گئے۔ مکمل مجموعہ چار جلدوں میں شایع ہو چکا ہے۔ مرزا کے خطوط اردو نثر کے نئے اور رجحان ساز اسلوب کا مظہر ہیں۔ یہ ایک ایسے انسان کی روداد حیات پر مشتمل ہیں جو اپنی محبت اور نفرت دونوں میں شدید تھا۔ خطوط کے پیرائے میں باتیں کرتا تھا۔ تکلف کو بے تکلفی کی نذر کرتے ہوئے زندگی کے معاملات و مسائل کو ذاتی پردہ داری سے نکال کر یار دوستوں کے درمیان رکھ دیتا تھا۔ مرزا کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو ان کے خطوط میں آئینے کی طرح روشن نہ ہو۔

شاعری مکاتیب اور سوانح عمریوں کی وجہ سے غالب اردو ادب کی بڑی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ان کی زندگی، محرومیاں، مالی پریشانیاں، ناقدریاں، زمانے کی چیرہ دستیاں۔ ادبی معرکہ آرائیاں ان کی خلقی بشاشت ذکاوت، انانیت، خارزار حیات میں ان کی برہنہ پائی اور حوصلہ۔ قہقہے لگانے اور غموں کو ہنسی میں اڑانے کی خصلت، خودداری، اعتماد، غیرت اور درِکعبہ وا نہ ہونے پر الٹے پھر آنے کی خوزباں زد خاص و عام ہے۔ وہ نابغۂ روزگار تھے۔ انتہائی ذہین اور فطین فن کار تھے رجحان ساز اور پیش بین سخن ور تھے۔ فارسی کو اپنا سرمایہ افتخار سمجھتے اور اردو کو اپنے مرتبے سے کمتر گردانتے تھے۔

فارسی بین تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعہ اردو کہ بے رنگ من است

یہ الگ بات ہے کہ مرتبہ انھیں اردو ہی سے حاصل ہوا اور ان کی فارسی شاعری اور نثر کتاب میں رکھے ہوئے خشک پھول کی طرح برصغیر میں فارسی شاعری کے مرجھانے اور سوکھنے کا اعلانیہ بن گئی

غالب کی محبت، شہرت اور عظمت مسلم مگر حد سے بڑھی ہوئی ذکاوت، خود اعتمادی اور انانیت نے ان کے مزاج میں کچھ ایسی کجی بھی پیدا کر دی تھی جس کی وجہ سے انھیں مخالفتوں اور ادبی معرکہ آرائیوں کا سامنا بھی کرنا پڑا اور ان کی تخلیقی توانائی بیت بحثی میں ضائع بھی ہوئی۔ انھیں جا و بے جا اعتراضات کا نشانہ بھی بننا پڑا۔ اردو اور فارسی دونوں کے حوالوں سے۔ اردو میں کمتر، فارسی میں بیشتر، فارسی میں بیشتروں کہ وہ اپنے آپ کو بنیادی طور پر فارسی ہی کا شاعر اور ادیب سمجھتے تھے اور امیر خسروؒ کے علاوہ برصغیر کے کسی شاعر کو مستند تو کیا درخور اعتنا بھی نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے صاف کہا تھا کہ ”اشعار قتیل و واقف و شعرائے ہندوستان محض موزونی طبع کا نتیجہ ہیں۔ ان کے یہاں نہ ترکیب فارسی، نہ معانی نازک، ہاں الفاظ فرسودہ عامیانہ جو اطفال دبستاں جانتے ہیں اور جو متصدی نثر میں درج کرتے ہیں وہ الفاظ یہ لوگ نظم میں صرف کرتے ہیں“ یہ رائے خلاف حقیقت اور تکلیف دہ ہے اور

اس حوالے سے اور زیادہ تکلیف دہ ہو جاتی ہے کہ فارسی گویان ہند میں مرزا کے ممدوح مرزا عبدالقادر بیدل بھی شامل ہیں جن کے طرز میں ریختہ کہنا غالب قیامت سمجھتے تھے اور "رنگ بہار ایجادی بیدل" کے دلدادہ تھے۔

یہاں بجا طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غالب خود بھی فارسی گویان ہند ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ دادا قوقان بیگ عہد شاہ عالم میں سمرقند سے ہندوستان آئے تھے اور صرف ترکی بولتے تھے۔ فارسی مرزا کی آبائی زبان تھی نہ مادری۔ فارسی کے حوالے سے ان کی بھی وہی حیثیت تھی جو دوسرے فارسی گویان ہند کی ہے لیکن وہ بزعم خود اپنے اپ کو ان سب سے علحدہ سمجھتے تھے چنانچہ انھوں نے اپنے ایک بزرگ کرم فرما حضرت صاحب عالم مارہروی کو ایک خط میں لکھا تھا کہ "ناصر علی اور بیدل اور غنیمت، ان کی فارسی کیا۔ ہر ایک کا کلام بہ نظر انصاف دیکھئے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ منت اور مکین اور واقف اور قتیل تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجئے۔ کلام میں ان کے مزا کہاں۔ ایرانیوں کی سی ادا کہاں" وہ خود یہ سمجھ بیٹھے تھے بلکہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ تمام فارسی گویان ہند بہ استثنائے خسرو" ایک طرف اور وہ خود دوسری طرف کہ ان کے یہاں ایرانیوں کی سی ادا اور کلام میں انہیں کا سا مزا ہے۔ انھوں نے اپنے اس خیال کی توضیح میں لکھا ہے کہ "یہ چیزیں میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر۔"

غالب کی اس روش اور ادا کو ان کے عہد کے اہل نظر نے پسند نہیں کیا۔ بیدل، غنیمت، واقف اور مکین کے مداحوں کا بھی ایک بڑا حلقہ موجود تھا جو غالب کے نقطہ نظر سے متفق نہیں تھا۔ رہ گئے قتیل تو ان کا مسئلہ ذرا مختلف تھا۔

قتیل کا انتقال غالب کے عنفوانِ شباب میں ہوا تھا۔ ان کے انتقال (۱۲۳۲ھ) کے وقت وہ بیس سالہ نوجوان تھے لیکن طرز بیدل میں مضامین خیالی کا ایک طومار لکھ کر مسترد کر چکے تھے۔ قتیل خوش گو شاعر، استاد، عالم، ماہر زبان و قواعد اور دانش ور تھے۔ عبدالحلیم شرر کے بقول لکھنؤ میں فارسی کا مذاق انہیں سے عام ہوا تھا۔ شرر نے یہ بھی لکھا ہے کہ قتیل نے برسوں اصفہان اور شیراز کی خاک چھانی تھی۔ ملک میں ان کے تلامذہ اور عقیدت مند بڑی تعداد میں موجود تھے جو ان کے اجتہاد زبان پر عمل پیرا بھی تھے۔ یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی نوجوانی اور اس کے بعد تک قتیل برصغیر میں فارسی شاعری کے افق پر چھائے ہوئے تھے۔

قتیل مضافات دہلی کے ایک قصبے فرید آباد سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے آباؤ اجداد غیر مسلم تھے۔ خاندانی نام دلوالی (دیوالی سنگھ) تھا۔ فارسی زبان و ادب کی تعلیم اچھے اساتذہ سے حاصل کی۔

سترہ برس کی عمر میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اسلامی نام مرزا محمد حسن رکھا گیا۔ قتیل فارسی کے علاوہ عربی اور ترکی سے بھی واقف تھے اور ان دونوں زبانوں میں بے تکلفی سے گفتگو کرسکتے تھے۔ مزاج میں آزادہ روی تھی۔ گھربار چھوڑ کر آزادانہ زندگی گزارتے رہے۔ جہاں رہے مقبول خاص و عام رہے۔ ایک مدت تک ذوالفقار الدولہ نجف خاں کے لشکر میں رہے۔ معاصر ادیبوں شاعروں اور دانش وروں سے مخلصانہ اور دوستانہ تعلقات تھے۔ انشا اور مصحفی دونوں سے یارانہ تھا۔ انشا کی تالیف "دریائے لطافت" کا آخری باب انہی کا لکھا ہوا ہے۔ مصحفی نے فارسی گویان ہند کا تذکرہ "عقد ثریا" انہیں کی تحریک پر مرتب کیا تھا اور احمد علی کو تذکرہ "مخزن الغرایب" مرتب کرنے پر بھی قتیل ہی نے آمادہ کیا تھا۔ ان کی تالیفات میں "چار شربت" "شجرۃ الامانی" نہرالفصاحت اور رقعات کا مجموعہ۔ رقعات قتیل وغیرہم مشہور ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ قتیل اپنے زمانے کی بہت معروف۔ مستند اور مشہور علمی شخصیت تھے۔

قتیل چونکہ عالم' استاد اور ماہر زبان و قواعد سمجھے جاتے تھے اور ان کے شاگرد و عقیدت مند بھی بہت تھے اس وجہ سے غالب کو ان سے ایک طرح کی چڑ پیدا ہو گئی تھی۔ فارسی زبان و ادب کے سلسلے میں قتیل کے حوالے عام تھے اور ان کے خیالات کو اہمیت دی جاتی تھی۔ ادھر غالب ذہنی طور پر خود کو قتیل کے مقابلے میں بہت بڑا ماہر زبان گردانتے تھے۔ یہاں تک تو کوئی حرج نہیں۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ بزعم خویش جو کچھ چاہے سمجھے۔ صورت حال خراب اس وقت ہوتی ہے جب ٹکراؤ کا انداز پیدا ہو جائے۔ غالب کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ان کے تبحر اور انانیت نے برصغیر کی ادبی فضا میں خاصی ہلچل پیدا کردی تھی۔

غالب اپنی پنشن کی درخواست کے سلسلے میں کلکتے گئے۔ اس سفر میں وہ مختلف شہروں سے گزرے۔ بعض شہروں میں قیام پذیر بھی ہوئے۔ ان کی اپنی شہادت کے مطابق ایک ادبی معرکہ الہ آباد میں بھی پیش آیا تھا۔

نفس بلرزہ زباد نہیب کلکتہ نگاہ خیرہ ز ہنگامہ الہ آباد

کلکتے کا ادبی معرکہ ذہن میں نہ ہو تو ہنگامہ الہ آباد' کو شہر کی رونق اور چہل پہل سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے لیکن کلکتے کے ذکر نے اسے ادبی معرکے کی معنویت دے دی ہے۔ اس شعری اشارے کے علاوہ "ہنگامہ الہ آباد" کی اور کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ غالب فروری ۱۸۲۸ میں اکتیس برس کی عمر میں کلکتے پہنچے۔ بنگال کی سرزمین اور آب و ہوا انہیں بہت پسند آئی۔ یہاں انہیں نئی فکر' نئے مزاج۔ نئی تہذیب۔ زندگی کے نئے تقاضوں اور نئے علمی امکانات سے آگاہی ہوئی۔ انہوں نے

تو آبادیاتی نظام کے سورج کی بلندی کو محسوس کیا۔ ذہنی طور پر بہت کچھ حاصل ہوا مگر مادی اعتبار سے ناکام رہے۔

اس زمانے میں کلکتے میں ہر انگریزی مہینے کے پہلے یک شنبے کو مدرسہ عالیہ میں بڑے اہتمام سے مشاعرہ ہوتا تھا۔ غالب بھی اپنے پہنچنے کے بعد منعقد ہونے والے پہلے مشاعرے میں شریک ہوئے اور انھوں نے دو فارسی غزلیں پڑھیں۔ پہلی غزل میں جب وہ اس شعر پر پہنچے

جزوے از عالم و از ہمہ عالم بیشم
ہمچو موئے کہ بتاں راز میاں بر خیزد

تو سر مشاعرہ حاضرین میں سے کسی نے اعتراض کیا کہ پہلے مصرعے میں تفضیل بعض یعنی بیش کے بجائے بیشتر ہونا چاہیے دوسری طرف سے آواز آئی کہ مصرع ثانی میں "موئے زمیاں" کی ترکیب بھی غلط ہے بلکہ پورا شعر ہی بے معنی ہے۔ ایک اور صاحب معترض ہوئے کہ ہمہ عالم کی ترکیب حسب اجتہاد قتیل غلط ہے۔

غالب نے دوسری غزل میں جب یہ شعر پڑھا۔

شور اشکے بہ فشار بن مژگاں دارم
طعنہ بر بے سرو سامانی طوفاں زدہ

تو پھر اعتراض ہوا کہ دوسرے مصرعے میں زدہ کا استعمال غلط ہے۔

مرزا اکتیس سالہ جوان۔ ترک افراسیابی' خون میں حدت' مزاج میں حرارت' طبیعت میں بلا کی خود اعتمادی' فارسی گویان ہند کو خاطر میں نہ لانے والے' ایک بار ہی بھڑک اٹھے۔ پوچھ بیٹھے "کون قتیل؟ وہی فرید آباد کا کھتری بچہ۔ میں کیوں اس فرید آبادی کو سند ماننے لگا" ان کا یہ کہنا کہ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ شہر میں شاگردان و حامیان قتیل بہت بڑی تعداد میں موجود تھے۔ انھوں نے غالب کے خلاف باقاعدہ محاذ بنا لیا اور بات یہاں تک بڑھ گئی کہ سربازار مرزا پر آوازے کسے جانے لگے۔

غالب کی طرف سے بھی بعض لوگوں نے اعتراضوں کے جواب لکھے لیکن شورش کی لے بہت تیز تھی۔ آسانی سے فرو ہونے والی نہیں تھی۔ غالب کو موقعے کی نزاکت کے خیال سے اپنی صفائی میں مثنوی باد مخالف لکھنا پڑی جس کے آخر میں بظاہر قتیل کی مدح ہے لیکن ہے دراصل ان کی ہجو ملیح ہے۔

نثر او بال نقش طاؤس است

انتخاب صراح و قاموس است
بادشاہے کہ در قلمرو حرف
کردہ ایجاد نکتہ ہائے شگرف
خام ہندوئے پارسی دانش
ہندیاں سرنخط فرمائش

اس معرکے کی گونج سارے ملک میں سنی گئی۔ غالب پہلے ہی قتیل سے متنفر تھے اب قتیل دشمنی میں اور شدید ہوگئے۔ حد یہ ہے کہ ان کے ایک شاگرد نے قتیل کو مرحوم لکھا تو انہوں نے جواب میں لالہ دیوالی سنگھ کھتری متوفی تحریر کیا۔ ایک اور جگہ لکھا کہ مشرک وہ ہیں جو نومسلموں کو ابوالائمہ کا ہمسر مانتے ہیں۔ نومسلم سے مراد ہیں مرزا قتیل۔ کہیں لکھا کہ وہ گھاگس الو عبدالواسع ہانسوی.... اور وہ الو کا پٹھا قتیل۔ کہیں ان کی کتاب کے بارے میں گل افشانی فرمائی کہ چار شربت اور غیاث اللغات کو حیض کا لتا سمجھتا ہوں۔ یہ اور اس قسم کے خیالات کا بے محابا اظہار غالب کے مزاج کی کجی کا بھرپور اظہار ہے۔ غالب کا قتیل کو الو کا پٹھا کہنا بالکل اسی ذہنیت کا غماز ہے جو ایک اور مرزا' مرزا یگانہ کے یہاں "الو کا پٹھا ٹھینگا موہانی میں ملتی ہے۔

بہرحال غالب حسب توفیق قتیل کے بارے میں مدح سرائی کرتے رہے۔ ان کے بزرگ کرم فرما صاحب عالم مارہروی قتیل کے شاگرد تھے۔ انھیں لکھ دیا کہ عقل کو کام میں لاؤ غور کرو۔ سمجھو۔ قتیل برہمنہ تھا۔ قتیل تو اس قابل بھی نہیں کہ اس کا نام لیجئے۔ ایک اور شاگرد کو لکھا ہے کہ قتیل اساتذہ سلف کے کلام سے قطعا" آشنا ہی نہیں ہے۔ کسی اور شاگرد کو طنزا" لکھا ہے۔ یہ فارسی لالہ قتیل کی ہے۔ غرض یہ کہ جہاں موقعہ ملا طنز و تعریض سے کام لیا بلکہ جو بھی چاہا لکھا اور خوش ہوئے

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ گیرودار میں غالب گھر کا دروازہ بند کئے لکھنے پڑھنے سے جی بہلاتے رہے ۱۸۵۷ کی معرکہ آرائی کے حوالے سے دستنبو مرتب کی اور محمد حسین تبریزی کی لغت برہان قاطع کے مطالعے میں جو تسامحات نظر سے گزرے تھے ۱۸۶۲ میں انہیں مدون کرکے ایک تیز و تند تنقید قاطع برہان کے عنوان سے شایع کی۔ قاطع برہان کی اشاعت بھی غالب کی زندگی میں ایک بہت بڑے ادبی معرکے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس معرکے کی تفصیل سوانح غالب کے ذیل میں بالعموم قلم بند کی جاچکی ہے۔ یہاں صرف یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس سارے ہنگامے اور اعتراضاتِ غالب کی تہہ میں برصغیر کے فارسی لغت و قواعد نویس بالعموم اور مرزا قتیل بالخصوص زد پر تھے۔ انھوں نے آغا علی اصفہانی کے نام فارسی میں ایک قطعہ لکھا ہے جس کے درج ذیل اشعار قابل توجہ ہیں

باقتیل و جامع برہان ولالہ ٹیک چند لابہ وسو گیری و لطف و مدارا کردہ است
انتقام جامع برہان قاطع می کشد انچہ ماکردیم با وے خواجہ باما کردہ است
من سپاہی زادہ ام گفتار من باید درشت وائے بروئے گر بہ تقلید من اینہا کردہ است

گویا آغا علی اصفہانی نے معید البرہان نامی ضخیم کتاب جو صاحب برہان کی تائید میں تالیف کی وہ دراصل محمد حسین تبریزی، قتیل اور ٹیک چند بہار کی خوشامد در آمد ہے۔ آج کل کی اصطلاح میں غالب ہر اس شخص سے الرجک تھے جس کے بارے میں انہیں یہ شبہ بھی ہو جاتا تھا کہ وہ قتیل یا فارسی گویان ہند کا مداح ہے۔

بات یہیں تک نہیں رہتی۔ غالب اس سلسلے میں اتنے شدید تھے کہ اپنی ولی نعمت نواب کلب علی خان سے بھی اس مسئلے میں الجھ پڑے اور پھر ان کی جانب سے صفائی کی کوششوں کے باوجود نواب صاحب کے دل سے یہ گرہ نہیں نکلی مگر انھوں نے عالی ظرفی کا ثبوت دیا اور غالب کی سرپرستی میں کوئی کمی نہیں کی۔

غالب قتیل اور فارسی گویان ہند کے مناقشے کا موضوع سنجیدہ اور تفصیلی علمی مطالعے کا متقاضی ہے۔ مولانا حالی غلام رسول مہر شیخ محمد اکرام اور سب سے بڑھ کر مالک رام نے حقایق کی روشنی میں اس موضوع کا جائزہ لیا ہے لیکن ان کے پیش نظر غالب کی پوری زندگی کا مرقع تھا۔ لہٰذا مناقشوں کی تفصیل میں اختصار کا انداز فطری اور لازمی تھا۔ صرف ایک چھوٹی سی کتاب اب سے تقریباً پچاس برس پہلے اس موضوع پر شائع ہوئی تھی۔ اس کے بارے میں اظہار خیال آگے چل کر ہو گا لیکن غالب کی قتیل دشمنی کا تفصیلی مطالعہ آج بھی کسی علم دوست غالب شناس کا منتظر ہے۔

۱۹۳۸ء میں مکتبہ جامعہ دہلی نے غالب کے بارے میں ایک چھوٹی سی کتاب ''ذکر غالب'' شایع کی تھی۔ مؤلف تھے مالک رام۔ مالک رام کی ذاتی تحقیق، دید و دریافت، ذوق و شوق اور غیر معمولی جدوجہد سے ذکر غالب کے ہر نئے ایڈیشن میں مفید اضافے ہوتے گئے اور آہستہ آہستہ اسے غالب شناسی کی بھرپور اور مستند دستاویز کا مرتبہ حاصل ہو گیا۔

۱۹۳۹ء میں مکتبہ جامعہ ہی نے غالب کے حوالے سے ایک اور چھوٹی سی کتاب ''قتیل اور غالب شایع کی۔ مولف تھے سید اسد علی انوری فرید آبادی۔ بی ایس سی۔ آئی ایف ایس۔ انوری نو آبادیاتی افسر شاہی کے رکن کی حیثیت سے علمی تحقیق و تالیف کی روایت کے قایل تھے۔ چنانچہ انھوں نے سائنس کے طالب علم اور محکمہ جنگلات کی سائیں سائیں کرنے والی ملازمت کے باوجود ہم وطنی کے تقاضوں یا حق شفعہ کے طور پر نہیں بلکہ سنجیدہ علمی انداز میں یہ کتاب مرتب کی ہے۔ اگرچہ

ان کی جانب سے یہ ایک سنجیدہ علمی کوشش تھی تاہم اسے غالب شناسوں کے حلقے میں مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ کیونکہ شیخ محمد اکرام کے علاوہ کسی اور نے اس کا تذکرہ نہیں کیا حالانکہ اس عہد کے علمی اور ادبی پس منظر اور ذہن و فکر غالب کی تفہیم کے لئے یہ ایک مفید اور کار آمد کوشش ہے اور ذمہ داری اور تحقیق سے مرتب کی گئی ہے۔

سید اسد علی انوری کا تعلق مضافات دہلی کے قصبے فرید آباد سے تھا۔ ان کے والد یوسف علی انوری علی گڑھ کے تعلیم یافتہ اور سرکاری ملازم تھے۔ انوری صاحب نے ابتدائی تعلیم فرید آباد میں حاصل کی۔ میٹرک اینگلو عربک اسکول دلی سے کیا۔ مزید تعلیم کے لئے علی گڑھ گئے جہاں سے انہوں نے ۱۹۳۲ء میں بی ایس سی اول درجے میں پاس کیا۔ ۱۹۳۳ء میں مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہوئے اور محکمہ جنگلات سے وابستہ ہوئے۔

انوری صاحب کو قومی اور تعلیمی کاموں سے دل چسپی تھی چنانچہ جس زمانے میں وہ اودھ کے قصبے لکھیم پور کھیری میں متعین تھے تو انہوں نے وہاں مسلمان بچوں کی تعلیم کے لئے اسلامیہ اسکول کے قیام میں بڑی محنت کی تھی۔

قیام پاکستان کے وقت وہ دہرہ دون کی آل انڈیا فارسٹ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ یہیں چلے آئے۔ یہاں انہوں نے بڑی مفید خدمات انجام دیں۔ پاکستان فارسٹ کالج اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی بنیاد رکھی اور اس کے پہلے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ پاکستان جرنل آف فارسٹری جاری کیا اس کے اولین مدیر بھی وہی تھے۔ پاکستان میں ریزن کا پہلا کارخانہ بھی انہیں کی کوشش سے قایم ہوا تھا۔

انوری صاحب جس زمانے میں صوبہ سرحد کے ناظم جنگلات تھے تو انہوں نے سید احمد شہید اور شہدائے بالا کوٹ کے مزاروں کی تلاش و تحفظ کا کام بھی کیا تھا اور وہاں ایک سنگی یادگار بھی تعمیر کروائی تھی۔

انتقال کے وقت وہ مغربی پاکستان کے چیف کنزرویٹر آف فارسٹ' تھے۔ انتقال ترپن برس کی عمر میں ۱۹۶۰ء میں ہوا تھا' قتیل و غالب کے علاوہ دو اور کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ صحیفہ چین مکتبہ جامعہ نے شایع کی تھی اور نقوش چین کی اشاعت مکتبہ جدید لاہور سے ہوئی تھی۔

میں نے انہیں کراچی میں ایک تقریب میں دیکھا تھا' تفصیلی ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔ عزیزوں کے بیان کے مطابق وہ حلیم الطبع' فنون لطیفہ کے شایق' انسان دوست اور منکسر المزاج انسان تھے۔ مطالعے کے بڑے شایق تھے اور قومی فلاح و بہبود میں بڑی دل چسپی رکھتے تھے۔

قتیل و غالب چھوٹی سی کتاب ہے جو ایک بڑے موضوع پر مرتب کی گئی ہے۔ اگرچہ اس میں سبک ہندی اور سبک ایرانی کی اصطلاحیں استعمال نہیں ہوئیں تاہم قتیل و غالب میں قتیل فارسی گویان ہند کے نمایندے اور غالب بزعم خوش سبک ایرانی کے ترجمان ہیں۔ انوری غالب کی یک طرفہ عظمت کے قایل ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے غالب کے سلسلے میں ان تمام باتوں کو کھل کر بیان کردیا ہے جو ان کے دوسرے سوانح نگاروں نے بڑے ہلکے اور نرم پیرائے میں قلم بند کی ہیں۔ اگرچہ ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ "ہیرو کو ہیرو بنائے رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی سوانح حیات میں جزوی تحقیق نہ کی جائے" ان کے بقول جزوی تحقیق سے ممدوح کی زندگی کے کمزور اور ایسے گوشے بھی سامنے آتے ہیں جنھیں پسندیدہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مگر بات یہ ہے کہ ہم جس سے محبت کرتے ہیں اس کے پورے وجود سے محبت کرتے ہیں خوبیوں کے ساتھ کمزوریوں اور حسن کے ساتھ بد وضعی کو بھی گوارا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ انوری نے قتیل و غالب کی ابتدا ہی میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غالب کا طرہ امتیاز اردو اور صرف اردو شاعری ہے ورنہ انسان کی حیثیت سے وہ چنداں قابل لحاظ نہیں مگر فن اور شخصیت کے خانے الگ الگ نہیں ہوتے۔ غالب اپنی ساری کمزوریوں کے ساتھ آفاقی ادب کی نمایاں شخصیت ہیں۔ انوری یہ تو مانتے ہیں کہ "اردو ادب خصوصاً شاعری میں مرزا غالب کا درجہ بلند ہی نہیں بلکہ بلند ترین ہے۔ وہ اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں" مگر ان کی طرز و روش حیات سے نالاں بھی ہیں۔ اپنی بات کی وضاحت کے لئے انھوں نے کتاب کے خاتمے میں یہ بھی لکھا ہے کہ "مجھے ان کی منتخب اردو شاعری کے بے مثل اور انمول ہونے کا اعتراف ہے۔ میں ان کے ایک ایک منتخب شعر کا گرویدہ ہوں۔ میرے دل میں مرزا غالب کی اردو شاعری اور رقعہ نگاری کی ایسی ہی اور اتنی قدر ہے جتنی کہ شاید کسی بھی غالب کے شیدائی کو ہو یعنی میں ان کے منتخب اردو کلام کو الہامی ماننے کے لئے تیار ہوں ہاں خود ان کو نبی ماننے میں مجھے کلام ہے"

انوری صاحب کا آخری جملہ بالکل صحیح ہے کیونکہ "لانبی بعدی" مشہور بات ہے لیکن انھوں نے غالب کی فارسی شاعری کو یکسر نظر انداز کیا ہے جسے ایک طرح کی زیادتی قرار دیا جائے گا کیونکہ غالب فارسی میں سبک ہندی کے شاعر ہونے کے باوجود فکر و اسلوب کی ندرت' بلندی' دل کشی' معنی آفرینی' حیات و کائنات کے عمیق مطالعے۔ انسانی جذبات کی رنگا رنگی اور ہند ایرانی ثقافت کے بہترین ترجمان کی حیثیت سے بڑا مرتبہ رکھتی ہے۔ ان کی فارسی شاعری کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

انوری صاحب نے حامیان قتیل و غالب کی معرکہ آرائی کی ساری بحث کو آٹھ اعتراضات پر مبنی قرار دیا ہے۔ ان کی رائے میں غالب نے قتیل کے بارے میں جو اعتراض کئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) مرزا قتیل اساتذہ سلف کے کلام سے نا آشنا ہیں۔ ان کے علم فارسی کا ماخذ ان لوگوں کی تقریر ہے جو کہ نواب سعادت علی خاں کے وقت میں ممالک مغربی کی طرف سے لکھنؤ میں آئے اور ہنگامہ آرا ہوئے۔

(۲) مرزا قتیل نے تحریر کو تقریر جیسا بنا دیا'' تقریر اور ہے تحریر اور ہے۔ اگر تقریر بعینہ تحریر میں آیا کرے تو خواجہ وطواط اور شرف الدین علی یزدی اور ملا حسین واعظ کاشفی اور طاہر وحید سب نثر میں کیوں خون جگر کھاتے۔ وہ سب اس طرح کی نثر جو لالہ دلوالی سنگھ قتیل متوفی نے بہ تقلید اہل ایران لکھی ہے کبھی رقم نہ فرماتے۔

(۳) مرزا قتیل کا دعوی ہے کہ کدہ کا لفظ سوائے پانچ اسما کے اور کسی سے ترکیب نہیں پاتا۔

(۴) اقسام نثر بیان کرنے میں قتیل نے غلطی کی اور مرجز و مسجّع کا فرق ٹھیک سے ظاہر نہیں کیا۔

(۵) قتیل ایطائے جلی و خفی کی صحیح تعریف سے نا آشنا ہیں

(۶) قتیل کا اجتہاد ہے کہ ہمہ کے لفظ کو جمع کے ساتھ لاؤ۔ مفرد سے نہ ملاؤ۔ ہمہ عالم۔ ہمہ روز ہمہ جا غلط ہے۔

(۷) قتیل نے لکھا ہے کہ جامہ گزاشتن بمعنی متردن صحیح ہے لیکن موقعہ دیکھ کر اور احتیاط سے استعمال ہونا چاہیے بقول غالب' احتیاط کیا اور موقعہ کیا

(۸) مرزا قتیل نے اپنے ایک شعر میں خاک نبود' ہیچ نبود کے معنوں میں لکھا ہے۔ خاک نبود اردو محاورے کا ترجمہ ہے۔ بقول غالب۔ ''ہندی میں کچھ نہیں کی جگہ خاک نہیں بولتے ہیں'' فارسی میں ہیچ نیست کی جگہہ خاک نیست کوئی نہیں کہے گا۔ قتیل چاروں خانے چت گرا۔

کشتہ برکشتہ تپاں بود دگر خاک نبود

یعنی ہیچ بند د۔ لاحول ولا قوۃ

ان میں سے بعض اعتراضات محض ہٹ دھرمی پر مبنی ہیں۔ مثلاً'' غالب کا یہ کہنا کہ ''قتیل اساتذہ سلف کے کلام سے قطعاً'' نا آشنا ہیں زبردستی کی بات ہے۔ ان کی تالیفات اور کلام سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اساتذہ سلف کے کلام سے پوری طرح واقف تھے۔

جہاں تک تحریر کو تقریر بنانے والے اعتراض کا تعلق ہے تو ''ایں گنا ہست کہ در شہر شما نیز

کتند" اس کا اطلاق خود غالب پر بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے بقول خود مکاتیب میں مراسلے کو مکالمہ بنادیا ہے۔ اگر قتیل نے یہ کوشش کی تو اس میں اعتراض کی کون سی بات ہے۔ اسی طرح یہ کہنا کہ قتیل اقسام نثر سے ناواقف تھے یا ایطائے جلی و خفی کو نہیں سمجھتے تھے محض سینہ زوری ہے۔ جامہ گزاشتن کے حوالے سے قتیل نے جس احتیاط کی تاکید کی ہے اس کا تعلق استعمال الفاظ سے نہیں بلکہ موقع کی نزاکت سے ہے لہٰذا اعتراض خود بخود بے معنی ہو جاتا ہے۔

انوری صاحب کا خیال ہے کہ ہمہ کے لفظ کو جمع کے ساتھ استعمال کرنے کا اجتہاد قتیل سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ سرمشاعرہ غالب پر اعتراض کرنے والے نے اپنی بات کو وزن دینے کے لئے قتیل کا نام خواہ مخواہ لے دیا کیونکہ ہمہ شب کی ردیف خود قتیل کی ایک غزل میں ملتی ہے "کدہ" کے لفظ کے ساتھ صرف پانچ الفاظ کے استعمال کی تخصیص پر انھوں نے سیر حاصل بحث کی ہے اور قتیل کی تالیف نہرالفصاحت کے حوالے سے ان کے موقف کی تائید کی ہے

اردو محاورے کے غلط فارسی ترجمے کو انوری صاحب نے تسلیم کیا ہے لیکن ان کا خیال ہے کہ یہ کوئی ایسی فاش غلطی نہیں جس پر قتیل کو مطعون کیا جائے۔ اس قسم کی غلطیاں فارسی گویان ہند کے علاوہ ایرانی شعرا کے یہاں بھی ملتی ہیں لیکن ان کی وجہ سے کسی ایرانی شاعر کے لئے ناملایم الفاظ استعمال نہیں ہوئے۔

انوری صاحب نے اعتراضوں کے جواب بڑی تفصیل سے قلم بند کئے ہیں اور قتیل کے کلام سے ان جوابوں میں اسناد فراہم کی ہیں۔ یہ ساری تفصیل سنجیدہ، متین اور علمی انداز میں ہے اور فارسی زبان و ادب کا زوق رکھنے والوں کے لئے بہت مفید ہے۔

اعتراضوں کے جواب کے بعد انوری صاحب نے غالب کے بعض تسامحات کا جایزہ لیا ہے۔ انھوں نے "غلطی سے تو غالب بھی بچے ہوئے نہیں ہیں" کے ذیلی عنوان کے تحت آٹھ صفحے لکھے ہیں اور پھر مختصر طور پر یہ بحث کی ہے کہ "کیا مرزا غالب کا علم فارسی الہامی تھا" ان کا خیال ہے کہ غالب کی فارسی دانی کی بنیاد بھی وہی قدما کا کلام اور تحریرات ہیں جن سے اور سب نے بھی کسب فیض کیا ہے۔ ہاں اس میں مراتب ہیں۔ غالب نے اس میں بہت جگر کاوی کی تھی اور اسی مناسبت سے انہیں اس پر عبور بھی حاصل تھا" غالب کی فارسی شاعری کے قایل نہ ہونے کے باوجود انوری صاحب نے یہاں غالب کی جگر کاوی اور عبور کو تسلیم کرلیا ہے۔ انھوں نے اس ضمن میں مولانا حالی اور انشا کی رائے پیش کی ہے۔ حالی کے بقول۔ "ایک ہندی نژاد اکتساب کے ذریعے سے خاص کر اس حصہ زبان میں جو فارسی کی محدود شاعری میں مستعمل ہے اہل ایران کی برابری کرسکتا ہے۔" انشا نے لکھا

ہے۔ "کتابوں اور اہل زبان سے سیکھنے سے بڑے پایے کے فارسی میں کہنے والے شاعر ہندوستان میں ہو چکے ہیں۔" ان خیالات کی روشنی میں فارسی دانی کے اعتبار سے قتیل کے مرتبے کو کم نہیں کیا جاسکتا۔ وہ یقیناً" فارسی زبان و ادب کے بڑے عالم تھے اور ان آرا سے غالب کے اس دعوے کی نفی بھی ہوتی ہے کہ برصغیر کے فارسی گو شعرا میں امیر خسروؒ کے علاوہ کوئی استاد مسلم الثبوت نہیں ہوا۔

انوری صاحب نے انہیں خیالات کی روشنی میں بحث کو آگے بڑھایا ہے۔ زباں دانی اور معانی آفرینی کے بیان میں غالب کے خلط بحث۔ ان کا معیار، قتیل کا معیار، قتیل کی فارسی دانی اور زباں دانی میں سماعی اور قیاسی علم کے بارے میں مختصر لیکن مدلل انداز سے اظہار خیال کیا ہے۔

غالب کے سوانح نگار مالک رام نے بھی ذکر غالب میں سماع اور قیاس کی بحث کی ہے۔ انھوں نے زبان کو ان علوم میں شمار کیا ہے جو سماع پر مبنی ہیں۔ ان میں قیاس سے کام نہیں چلتا۔ دوسرا اصول انھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ جو زبان کسی ملک میں بولی جاتی ہے وہ اس ملک کے باشندوں کی مادری زبان ہوتی ہے اور وہ لوگ اہل زبان کہلاتے ہیں۔ زبان میں تصرف کا حق انہیں کو پہنچتا ہے۔ تیسرے اصول کے مطابق زباں دان کی تحریر میں اہل زبان کی سی سادگی، آمد، بے ساختگی اور شیرینی نہیں ہوتی۔ چوتھے اصول کا تعلق اسناد سے ہے۔ کسی لفظ یا محاورے کی غلطی یا درستی کی بحث میں اہل زبان ہی کی سند سے فیصلہ ہوگا۔

اصولوں کی اس وضاحت کے بعد مالک رام نے یہ لکھا ہے کہ مرزا غالب فارسی گویان ہند پر اعتراض کرنے میں حق بجانب تھے۔ انھوں نے یہ ثابت کردیا کہ فارسی گویان ہند ہرگز قابل اعتبار نہیں۔ یہ اپنے قیاس کی پیروی میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے ہیں بلکہ دوسروں کی گمراہی کا سبب بھی بنتے ہیں۔ مگر مالک رام نے یہ نہیں لکھا کہ خود غالب بھی فارسی گویان ہند میں شامل تھے۔ ان کا شمار اہل زبان میں نہیں ہوسکتا تھا اور دوسرے فارسی گویان ہند کی طرح وہ بھی قابل اعتبار نہیں تھے۔ سارا جھگڑا اس لئے شروع ہوا کہ وہ دوسروں کو بے اعتبار اور خود کو صاحب اعتبار سمجھتے تھے۔

یہاں اس امر کی نشاندہی بھی ضروری ہے کہ آج کے دور میں زبانوں کے پھیلاؤ میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے اور سماع و قیاس کی بحث از کار رفتہ ہوگئی ہے۔ کیفیت یہ ہے کہ انگریزی جیسی بڑی اور عالم گیر زبان کے اہل زبان نے دنیا کے مختلف ممالک میں بولی اور لکھی جانے والی انگریزی کو معیاری تسلیم کرلیا ہے۔ بابوز انگلش کی پھبتی یا امریکی محاورے کا طنز ان دنوں بے معنی سمجھا جاتا ہے۔ اس صورت حال میں سماع و قیاس کی بحث اور زبان کی برہمنیت میں کوئی معنویت نہیں رہی۔ اہل زبان اور زباں داں دونوں ایک ہی سطح پر آگئے ہیں۔ تاہم اہل ایران کو اپنے سبک کی برتری کا احساس اب

بھی ہے۔ امیر خسروؒ کے دیوان مطبوعہ طہران میں سعید نفیسی کے مقدمے میں "بزرگ ترین شعرائے فارسی ہند" کے الفاظ موجود ہیں جن کا صریح مطلب یہ ہے کہ فارسی گویان ہند کو آج بھی اہل ایران کی نظر میں اعتبار حاصل نہیں ہے۔

مالک رام نے ان معرکوں کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے لئے مرزا خود ذمہ دار تھے۔ انھوں نے اپنی درشت گفتاری کی جو توجیہہ کی ہے وہ بہت بودی ہے۔ کوئی لاکھ سپاہی زادہ ہوا کرے اسے ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی دوسرے کا مذاق یا تمسخر اڑائے یا اسے سخت ست کہے خاص کر جب بحث کا موضوع بھی علمی اور تحقیقی ہو۔ بے شک مرزا نے اپنی تحریر میں شوخ طبعی اور بذلہ سنجی کے جوہر دکھائے ہیں لیکن علمی مسئلوں کی تحقیق میں شوخی اور ظرافت نہیں متانت اور سنجیدگی درکار ہوتی ہے۔

انوری صاحب نے غالب کی شوخ طبعی بلکہ شوخ چشمی کا سنجیدگی سے جایزہ لیا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں علمی بحثوں میں ذاتیات کو شامل کرلینا ایک دستور سا ہوگیا ہے۔ ادھر کسی نے کوئی بات کہی اور ادھر اس کے خلاف ایک محاذ وجود میں آگیا۔ غالب بھی اپنی آزاد خیالی اور آزادہ روی کے باوجود اس دستور سے مبرا نہیں تھے چنانچہ انھوں نے فارسی گویان ہند اور بالخصوص قتیل کے بارے میں بڑے ناروا خیالات کا اظہار کیا ہے۔ قتیل مشرف بہ اسلام ہوگئے تھے لیکن غالب نے انہیں ہمیشہ طنزاً "نو مسلم کہا اور لکھا اور ان کے لئے نہایت قبیح الفاظ استعمال کئے جو کسی طرح بھی اہل علم کے شایان شان نہیں تھے۔

انوری صاحب نے اپنے سنجیدہ علمی جایزے میں ناروا الفاظ استعمال نہیں کئے لیکن ریکارڈ درست رکھنے کی خاطر انھوں نے غالب کی زندگی کے منفی پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔ اعتراضاً" نہیں بلکہ غالب کی ذہنیت کی بہتر تفہیم کے لئے۔ اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لئے انہیں اس کی ضرورت بھی تھی۔

"قتیل و غالب" ایک بڑی ادبی بحث' بڑے ادبی معرکے' مختلف علمی رجحانات' دعووں اور ان کے جوابات کی تفہیم کی اولین باضابطہ اور سنجیدہ کوشش ہے۔ "یادگار غالب" سے "ذکر غالب" تک قتیل و غالب کے معرکے کا تذکرہ ہر کتاب میں ملتا ہے لیکن ضمنی طور پر اور فارسی گویان ہند کے' کسی جواب یا بیان صفائی کے بغیر۔ چنانچہ عام طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ قتیل اور دوسرے فارسی گویان ہند غیر مستند۔ زبان و ادب کے سطحی علم کے حامل اور غلط روش کے عامل تھے۔ انوری صاحب نے اپنی کتاب کے ذریعے سے اس طلسم کو توڑنے کی کوشش کی ہے اور ایک نئی راہ کی نشان دہی کی ہے۔

انھوں نے انصاف اور دیانت کے تقاضوں کو مد نظر رکھا ہے۔ حوالے اور سند کے بغیر کوئی بات نہیں کہی مگر ان کی یہ کوشش غالباً" طرف داران غالب میں بہ نظر استحسان نہیں دیکھی گئی اور "قتیل و غالب" تقریباً" گمنام ہی رہی۔ میری معلومات کی حد تک اس کا تذکرہ شیخ محمد اکرام کے علاوہ کہیں اور نہیں ملتا۔ میرے لئے بھی اس کی بازیافت ایک دل چسپ داستان کی حیثیت رکھتی ہے۔

میں نے یہ کتاب اپنے زمانۂ طالب علمی میں پڑھی تھی۔ فارسی زبان و ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے مجھے غالب اور فارسی گویان ہند کی معرکہ آرائی سے دل چسپی تھی۔ اس بنا پر مجھے یہ کتاب مفید اور معلومات افزا معلوم ہوئی ۱۹۴۸ء میں لاہور کے ایک کتب فروش کے یہاں یہ پھر نظر پڑی۔ میں نے اسے فوراً" خرید لیا۔ دوبارہ پڑھا اور اپنے پہلے تاثر میں کسی ترمیم کی گنجایش محسوس نہیں کی بلکہ یہ خیال ہوا کہ اگر یہ کتاب دوبارہ شایع ہو جائے تو بہتر ہو لیکن پھر اس کے بعد یہ کتاب میرے ذخیرہ کتب میں اس طرح گم ہوئی کہ بڑی تلاش اور جستجو کے باوجود دست یاب نہیں ہوئی۔

کچھ دن ہوئے انوری صاحب کے بڑے خویش ڈاکٹر منظور زیدی کے یہاں جانا ہوا۔ واپسی کے وقت وہ اور ان کے صاحب زادے ڈاکٹر ظفر زیدی حسب دستور مجھے گیٹ تک چھوڑنے آئے۔ میں نے ڈاکٹر ظفر زیدی سے کہا۔ "تمھیں معلوم ہے کہ تمھارے نانا نے غالب کے حوالے سے ایک کتاب لکھی تھی" ڈاکٹر ظفر نے کہا "وہ میرے پاس ہے۔" یہ سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی اور میں نے ان سے کہا "میں اسے مدت سے دوبارہ شایع کرنا چاہتا ہوں۔" ڈاکٹر ظفر نے کہا "آپ ٹھہریے۔ میں ابھی لاتا ہوں" ذرا دیر بعد وہ منھ لٹکائے ہوئے آئے اور بولے کہ مل نہیں رہی ہے۔ میں پھر تلاش کروں گا"

بات رفت گزشت ہوگئی۔ لیکن ہونے والی بات ہو کر رہتی ہے۔ ڈاکٹر ظفر سے گفتگو کے بعد مجھے یہ کتاب کسی تلاش و جستجو کے بغیر اپنی کتابوں ہی میں مل گئی اور میں نے اسے ایک بار پھر پڑھنا شروع کر دیا۔ مطالعے کے بعد یہ خیال راسخ ہوگیا کہ اس کتاب کی دوبارہ اشاعت ہونا چاہیے۔

اتفاق یہ کہ کچھ ہی دن بعد ایک تقریب میں ڈاکٹر ظفر زیدی نے اطلاع دی کہ کتاب مل گئی ہے۔ اس تقریب میں انوری صاحب کے صاحب زادے ڈاکٹر محسن علی بھی موجود تھے جو ابو ظہبی میں مقیم ہیں۔ انھوں نے نہایت خوش دلی سے انوری صاحب کے حالات زندگی فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ یہ وعدہ ڈاکٹر منظور زیدی اور ڈاکٹر ظفر زیدی کے حسن توسط سے پورا ہوا۔ انوری صاحب کے حالات زندگی انہیں کے فراہم کردہ ہیں۔ میں ان تینوں صاحبوں کی توجہ، دل چسپی اور اعانت کا ممنون ہوں۔

فضلی سنز کراچی کے فعال اور مستعد سربراہ طارق رحمٰن صاحب نے اس کتاب کو فوری طور پر

اپنے اشاعتی پروگرام میں شامل کرلیا اور اس طرح غالب کی دو سو سالہ سال گرہ کے حوالے سے یہ چھوٹی سی لیکن مفید اور علمی دستاویز ایک بار پھر منظر عام پر آ رہی ہے۔ میں ان کا خاص طور پر ممنون ہوں۔

میں نے اس تعارفی تحریر میں مختلف اقتباسات کے حوالے علحدہ سے درج کرنے کا التزام نہیں کیا ہے کیونکہ مالک رام کی ذکر غالب کے دو حوالوں کے سوا باقی تمام حوالے اسی کتاب سے تعلق رکھتے ہیں۔

غالب اردو اور فارسی دونوں میں فکر و فن کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہیں اور ہمیشہ فائز رہیں گے۔ ''قتیل و غالب'' ان کے کمالات فکر و فن کا انکار نہیں، فکر و فن کے ایک خاص رجحان کو سمجھنے کی کوشش ہے۔ انھوں نے کہا ہے۔

تا بادہ تلخ ترشود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

دراصل آبگینہ اتنا گداز ہو گیا ہے کہ اس نے غالب ہی کے دل و جگر کو نہیں چھیدا دوسروں کو بھی اپنا نشانہ بنالیا ہے۔ ''قتیل و غالب'' اسی نشانے کی نشان دہی ہے کہ بقول غالب۔

تپش شوق نے ہر ذرے کو اک دل باندھا

اسلم فرخی

بی ۱۵۵ / ۵
گلشن اقبال۔ کراچی

مردہ پروردن مبارک کار نیست
خود بگوکاں نیز جز گفتار نیست   غالب

قتیل اور غالب

ع ۔ غلطی ہائے مضامین مت پوچھ   غالب

غالب اُردو شاعری کے ہیرو ہیں

انگریزی راج کی اور "برکتوں" سے تو خواہ ہندوستانی "منکر" ہو جائیں لیکن ایک چیز جو غالباً آسانی سے نہ "جھٹلائی" جا سکے وہ وطن پرستی کا وہ شدید قسم کا احساس ہے جو اب کوئی پچاس ساٹھ برس اُدھر سے خاصی قوت کے ساتھ ہمارے افعال اور ارادوں میں کار فرما ہے۔ یوں کہنے کو تو ہمارے برادرانِ وطن اس جذبے کی بنیاد بھی وید یا شاستر کے کسی اشلوک میں ثابت کر دکھائیں گے کیونکہ ان کے نزدیک روئے زمین پر کوئی ایسی چیز نہ ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے جس کا مفصل ذکر وید میں پہلے ہی سے موجود نہ ہو۔ حتیٰ کہ:۔

وید میں ریل، بان[1] اور تار[2]   وید میں ہے سارا سنسار

[1] بان یعنی ہوائی جہاز   [2] تار یعنی تار برقی

یا مسلمان کہیں کہ:۔

ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے　　　　گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے　　　　قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

لیکن اس کے باوجود ہماری زندگیاں اور ہمارے نقطہ ہائے نظر ناقابلِ انکار حد تک اس جذبہ اور احساس سے متاثر ہوتے جاتے ہیں۔ اسی اثر کے ماتحت زبان اور ادب کو ایک خاص نیت اور خاص کوشش کے ساتھ اُبھارا جارہا ہے۔ اور شہسواران میدانِ ادب کو اس مقام پر لانے کی کوششیں ہیں جس کے گو وہ ہر طرح اہل تھے لیکن زمانے کی ناقدری نے ان کو وہاں تک پہنچنے نہ دیا تھا۔ ان مساعی کی مبارک ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہی کی بدولت ہمارے ادب کے وہ درخشاں ستارے پورے طور پر منظرِ عام پر آئے ہیں جن کا کلام دنیا کی کسی بھی زبان کے ادب کے لئے باعث صد افتخار ہو سکتا ہے۔ انہی میں مرزا غالب بھی ہیں اور سچ یہ ہے کہ وہ اس مجموعے میں بمنزلہ ماہتاب ہیں۔ اُردو ادب خصوصاً شاعری میں مرزا غالب کا درجہ بلند ہی نہیں بلکہ بلند ترین ہے۔ وہ اُردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں اور اس حیثیت سے ہم جتنی بھی ان کی قدر کریں اور جتنا بھی ان کے نام کو اُبھاریں کم ہے۔ مولانا حالی مرحوم نے یادگارِ غالب لکھ کر سب سے پہلے یہ خدمت انجام دی اور پھر اس کے بعد تو غالب پر مضامین کا تانتا بندھ گیا۔ ان کے کلام کی متعدد شرحیں شائع ہوئیں۔ اور ہو رہی ہیں۔ ان کی شاعری کے "فلسفہ" اور "پیغام" پر نئے سے نئے

مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ ان کے ذہنی ارتقا کو ان کے دیوان کے مختلف اڈیشنوں کی مدد سے جانچا اور تولا جا رہا ہے۔ ان کے کلام میں قنوطیت اور رجائیت، رشک اور بدگمانی، صبر اور شکر، ہجر اور وصل، وفا اور جفا، التفات اور بے اعتنائی، سادگی اور پرکاری، لاگ اور لگاؤ غرضکہ ہر جذبے کو پرکھا جا رہا ہے۔ ان کے رقعات کے مختلف اڈیشن شائع ہو رہے ہیں اور اب کچھ عرصے سے ان کے سوانح حیات بھی محقق کی عقابی نظروں سے محفوظ نہ رہ سکے ہیں۔

> ہیرو کو ہیرو بنائے رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی سوانح حیات میں جزوی تحقیقات نہ کی جائے

مرزا غالب کی نثر و نظم کے جواہر پاروں کو نئے سے نئے زاویۂ نگاہ سے دیکھنا اور ملک کے سامنے پیش کرنا اصل میں ان کی خدمت نہیں بلکہ خود اپنے ادب، اپنی روایات اور اپنے تمدن کی خدمت ہے کہ جس سے ہندی مسلم تہذیب کو بقا اور دوام حاصل ہو سکتا ہے لیکن جہاں تک سوانح حیات کا تعلق ہے۔ ہمارا خیال عام اور متعارف نظریہ سے بالکل مختلف ہے۔ کسی کو قومی ہیرو بنا لینے کے بعد اس کے پرستاروں میں غیر محسوس طریقہ پر یہ چیز سرایت کر جاتی ہے۔ کہ اس ہیرو میں کسی قسم کی بھی کمی یا کمزوری نہیں ہے۔ اور یہی راز ہے ہیرو کو ہیرو سمجھتے رہنے کا۔ ورنہ شاید اس نفسیاتی حقیقت سے کسی کو انکار نہ ہو کہ اگر ہیرو میں خطا اور غلطی یا وہ چھوٹی چھوٹی اور ہلکے درجے کی کمزوریاں جو عوام میں پائی جاتی ہیں مان لی جائیں تو پھر وہ ہیرو نہیں رہ سکتا۔ یہیں سے حقیقت اور ضرورت کا تنافر اور تصادم ظاہر ہے۔ ضرورت کا تقاضا

ہے کہ ہیرو کو ہر غلطی سے مبرا اور ہر خوبی سے متصف بتائیے ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ نبی کے علاوہ ہر انسان مرکب من الخطاء ہے ۔ یہ مانا کہ اس حقیقت کے باوجود انسان انسان بھی رہ سکتا ہے اور ہیرو بھی بن سکتا ہے ۔ لیکن یہ بات، خصوصاً ہیرو کے متعلق اکثریت کے ذہن سے اکثر نکل جاتی ہے ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ہیرو کا بننا یا بگڑنا اکثریت پر منحصر ہے نہ کہ ان چند حق بیں اور حق گو حضرات پر جو کسی شخص کی غلطیوں کو جانتے اور مانتے ہوئے بھی اس کی خوبیوں کی کما حقہٗ داد دے سکتے ہیں ۔ اسی لئے ہمارا خیال ہے کہ اپنے ہیروؤں کے نجی حالات اور سوانح حیات کو بہت زیادہ محققانہ نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے ۔ کیونکہ اس کے علاوہ حقیقت اور ضرورت میں تطابق کرنے کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا ۔ ہمارے نزدیک مناسب صورت صرف یہی ہے کہ ان گرانمایہ اور قابل قدر خوبیوں کو تا حتی المقدور ابھارا اور اُچھالا جائے جنکی وجہ سے کسی ہیرو کا نام زندہ ہے لیکن اس کے علاوہ اس کی زندگی کی دیگر غیر ضروری باتوں کو بس ایک مبہم اور عام طریقہ پر ظاہر کر دینے کے بعد اس میں تحقیق و تدقیق کو زیادہ دخل نہیں دینا چاہیئے ۔ کہ یہ "کوہ کندن و کاہ برآوردن" ہی نہیں بلکہ اکثر "جتنا چھانو اتنا ہی کرکرا" کے مصداق ہوتا ہے ۔ معمولی سے معمولی اور جزدی سی جزدی بات تو اس شخص کی تلاش اور جستجو سے معلوم کی جائے جس کے متعلق یقین ہو کہ اس کا ہر فعل اور ہر ارادہ قابل ستائش اور دنیا کے لئے مشعل راہ ہوگا ۔ جیسا کہ آنحضرت صلعم کہ احادیث و سیر کی کتب صحیحہ کی یہ فراوانی حضور کی خصوصیات کو اور بہتر سے بہتر طریقہ پر دنیا کے سامنے

پیش کرتی ہے ۔ عام انسانوں کے لئے تو یہ خورد بینی اور ژرف نگاہی صرف ایسے ہی نتائج پیدا کر سکتی ہے جو ان کی شہرت کے منافی ہوں۔ اور یہ بدیہی سی بات ہے۔ کیونکہ جو خوبیاں ان کی شہرت عام اور بقائے دوام کی ضامن ہیں وہ تو ظاہر ہیں ہی۔ اب جو باتیں زمانے نے بھلا دیں وہ وہی ہو سکتی ہیں جو گویا اتنی اعلیٰ درجہ کی اور خصوصی نہ تھیں کہ مرورِ زمانہ سے عہدہ برآ ہو سکتیں۔ پھر اگر ان سب باتوں کو بہ تفصیل تمام معلوم کرنے کی کوشش کی جائے تو ظاہر ہے کہ وہ یا تو زیادہ سے زیادہ "خامی" نکلیں گی اور یا پھر "نکمی"۔ اعلیٰ درجہ کی تو ہو نہیں سکتیں۔ کہ اگر ایسی ہوتیں تو خود زندہ رہتیں۔ مختصر یہ کہ اس قسم کی تحقیق و تدقیق شروع تو اس نیت سے ہوتی ہے کہ شخصِ مخصوص کو زندہ رکھا جائے۔ اس کی ایک ایک بات کو جلایا جائے اور گویا اس کی خدمت کی جائے۔ اور ختم اس پر ہوتی ہے کہ جتنی عظمت اور قدر پہلے تھی وہ بھی نہیں رہتی۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ اپنے قومی ہیروؤں کی سوانح عمریاں لکھی ہی نہ جائیں۔ اور ان کو محض دیومالا کے افراد بنا کر چھوڑ دیا جائے۔ یہ تو گویا خودکشی کے مترادف ہوگا۔ لیکن ہمارا یہ ضرور خیال ہے کہ مخصوص خوبیوں کے علاوہ (جن کی زیادہ سے زیادہ توصیف و تشہیر ہونی چاہیئے) ان حضرات کے دیگر خد و خال اُبھارنے میں بہت زیادہ باریک بینی کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ پھر یا تو ان ہستیوں کی پہلی سی عظمت ہمارے دلوں میں نہ رہ سکے گی اور یا پھر سوانح نگار کو دانستہ ہٹ دھرمی اور تعصب سے واقعات میں تصرف و تبدیلی کرنی ہوگی۔

سوانح حیات میں ضرورت سے زیادہ تحقیق نے غالب کی عظمت کم کر دی	اصل میں ذکر مرزا غالب کا تھا۔ اگرچہ خود انھوں نے فارسی کے مقابلے میں اپنی

نظم ونثر اُردو کو ہمیشہ کم مایہ اور اپنی شہرت کے منافی سمجھا بلکہ اس زبان میں کلام تک کرنا ننگ سمجھتے رہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کی موجودہ شہرت محض اور مطلق ان کی اُردو نظم ونثر کی بدولت ہے۔ لہذا ہماری ساری کوششیں انہی دو چیزوں کو بہتر سے بہتر رنگوں میں اور معقول سے معقول زاویۂ نگاہ سے پیش کرنے میں صرف ہونی چاہئیں۔ جہاں تک سوانح حیات کا تعلق ہے وہ مختصراً اور اس نیت سے لکھی جائیں کہ ان کی زندگی کے اچھے پہلو اور زیادہ روشن ہو جائیں۔ یعنی بے جا تعصب اور غلط بیانی کی بھی ضرورت نہ پڑے اور ان کی ہستی کی تاریخی حیثیت بھی قایم ہو جائے۔ اس نظر سے دیکھئے تو ماننا پڑیگا کہ حالی مرحوم کی یادگارِ غالب نہ صرف غالب کی پہلی سوانح عمری ہونے کی وجہ سے ممتاز ہے بلکہ یوں بھی بے عدیل اور بے نظیر ہے۔ خواجہ حالی طبعاً غلط بیانی اور بے جا تعصب کو برداشت نہ کر سکتے تھے لیکن انھوں نے سوانح نگاری کے حسب بالا اصول اور مفہوم کو خوب سمجھ لیا تھا۔ وہ خود حیات جاوید کے دیباچہ میں کہتے ہیں کہ یہ تصویر یک طرفی ہے۔ اور اس کتاب میں مصنف نے مرزا کے "کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور ان کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی"۔ اب آپ یادگارِ غالب پڑھ جایئے۔ بعض محض سطحی واقعات یا ان کی تاریخ وتوزیع کی تقدیم وتاخیر کے متعلق بعض فرو گذاشتوں کے علاوہ کہیں بھی آپ ناجائز تعصب

کا اثر نہ پائیں گے۔ اور اس کے باوجود غالب اور ان کی زندگی کا جو خاکہ اس کو پڑھ کر ہماری نظروں کے سامنے کھنچ جاتا ہے اس سے بہتر ممکن نہیں۔ شاعری کے علاوہ ان کی خصوصیات میں ان کی ذہانت، طباعی، حاضر جوابی، ظرافت، فہم و ادراک مابہ الامتیاز تھیں اور یہی وہ چیزیں ہیں جن پر یادگار نے خصوصیت سے اور نہایت ہی دلچسپ اور دلفریب طریقوں سے زور دیا ہے۔ اس سے زیادہ تحقیق کی نہ ضرورت تھی اور نہ غالب کی زندگی اس کی متحمل ہو سکتی تھی۔ اسی طرح ان کا مروجہ اردو دیوان اور نثر میں عود ہندی اور اردوئے معلیٰ ان کی شہرت کے لئے کافی تھیں۔ اس کے علاوہ گو اردو میں ان کے بہت سے اور بھی اشعار تھے وہ خود غالب ہی نے نہایت معقول وجہ کی بنا پر نظر انداز کر دیئے تھے۔ مختصراً غالب کا مروجہ اردو دیوان، غالب کی اردو نثر اور یادگار غالب یہ تین چیزیں ہیں جنھوں نے غالب کو غالب بنایا[1] لیکن اب جو تحقیق اور

---

[1] اس کے اعادہ کی تو کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی کہ غالب کی شہرت میں ان کی فارسی نظم و نثر کو کوئی دخل نہیں۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ان کی فارسی شاعری بہت بلند پایہ ہے۔ تب بھی اس کی قدر دانی کے لئے ہندوستان میں کوئی گنجائش نہیں۔ ان سے بہت بہتر ہندی نژاد فارسی شاعروں مثلاً خسرو و بیدل وغیرہ کی کون قدر کر رہا ہے جو غالب کو کوئی پوچھتا۔ مرزا کی فارسی نثر تو بلاشبہ کچھ بہت اچھی بھی نہیں۔ "غالب نامہ" کا فیصلہ سنئے "جہانتک معنی کا تعلق ہے اس پر ان کی بیان کی مثل صادق آتی ہے۔ کہ چھلکے ہی چھلکے ہیں (بقیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)

باریک بینی کی روچلی تو غالب کو ابھارنے کی بجائے اور ڈبو دیا۔ پہلے شاعری ہی کو لیجئے۔ بڑی کوشش اور کاوش سے نسخہ حمیدیہ چھپوایا گیا۔ لیکن اہلِ نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اس سے غالب کی شاعرانہ عظمت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ گو یہ صحیح ہے کہ خود غالب نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ

(بقیہ فٹ نوٹ از صفحہ گذشتہ) مغز کا نام نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ باوجودیکہ مہر نیم روز جو مغلیہ بادشاہوں کی تاریخ ہے اور جس کی تاریخی اہمیت اس وجہ سے کہ آخری مغلیہ بادشاہ کے زیرِ فرمان درباری مورخ نے لکھی بہت ہونی چاہیئے کچھ بھی نہیں۔ اس کے دوسرے حصے کے لکھنے کی نوبت نہیں آئی ...... ممکن ہے بہادر شاہ جو سادہ اور موثر طرزِ تحریر پسند کرتا تھا اسے مرزا کی ٹیڑھی ترکیبیں اور استعاروں اور تشبیہوں کے انبار میں اصل مطلب خبط کر دینا ناپسند ہوا ہو اور اس نے اس کی تکمیل غیر ضروری سمجھی ہو" صفحہ ۶۸ و ۶۹۔ اسی طرح مرزا کی اس درخواست پر کہ دستنبو سرکاری خرچ پر طبع کی جائے حکم ہوا کہ اس کی زبان پرانی قسم کی فارسی ہے جا بجا نامانوس اور بعید الفہم ہے۔ اس لئے حکومت کا اسے اپنے خرچ سے شائع کرنا بے سود ہے" ذکرِ غالب صفحہ ۶۱ و ۶۲۔ مرزا کی فارسی شاعری کے متعلق بھی شیخ محمد اکرام صاحب کی رائے سنئے :- "غالباً یہ صحیح ہے کہ جو قوتِ اظہار ان کو (غالب کو) اردو پر تھی وہ فارسی پر حاصل نہ ہوئی۔ اور خواہ مرزا خود کچھ کہیں لیکن شاعرانہ نقطۂ نظر سے دیوانِ اردو کا مرتبہ دیوانِ فارسی سے کسی قدر بلند ہی ہے" غالب نامہ صفحہ ۱۲۴۔ نظم و نثر پر ایک مجموعی رائے بھی سن لیجئے :- "مرزا کو اپنے فارسی قصائد اور فارسی نثر پر بے حد ناز تھا اور فارسی غزلگوئی میں بھی وہ خواجہ حافظ کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ لیکن باوجودیکہ ہم مرزا کے فارسی کلام کی اہمیت مانتے ہیں، مرزا اسے جس قدر بلند پایہ سمجھتے تھے اس سے متفق ہونا کسی طرح ممکن نہیں" صفحہ ۱۵۰ غالب نامہ

مروجہ دیوان کے علاوہ جو اشعار ہوں وہ میرے نہ سمجھے جائیں کہ وہ میری شہرت کے منافی ہیں[۹۱]۔ لیکن اب نسخہ حمیدیہ کی اشاعت کے بعد یہ معلوم ہو گیا کہ مروجہ مختصر سا دیوان ایک ضخیم اور اکثر و بیشتر نہایت ناپسندیدہ دفتر کا انتخاب ہے جو مولانا فضلِ حق خیر آبادی، مفتی صدرالدین آزردہ اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی جوہر بیں نظروں کا رہینِ منت ہے۔ شیخ محمد اکرام صاحب کے بقول "حقیقت یہ ہے کہ اگر دیوانِ غالب تمام کا تمام شائع ہو جاتا تو خدشہ تھا کہ جہاں اتنے سیپ اور کوڑیاں تھیں وہاں سچے موتی بھی نظر سے نہاں ہو جاتے[۹۲]" پھر آگے فرمایا "اردو ادب ان کا (مرزا کے معاصرین کا) ممنون ہے کہ انھوں نے تنقید اور تمسخر سے مرزا کو ان سرخ و سفید خزف ریزوں کو جمع کرنے سے روکا[۹۳]" اس طرح تو پھر اکثر شعرا کے کلام کا انتخاب ہو سکتا ہے جو اگر غالب کے دیوان سے اچھا نہیں تو کچھ بہت برا بھی نہ ہو گا۔ ممکن ہے دوسروں کا منتخب دیوان حجم میں شاید اور بھی کچھ کم ہو۔ لیکن اس کے علاوہ غالب میں کوئی خاص خوبی باقی نہیں رہتی۔ تھوڑے بہت اچھے شعر تو ہر ایک شاعر کہہ ہی لیتا ہے۔ سید انشا اللہ خاں انشا کی ایک کنیزک چنبیلی نام یاسمن تخلص کرتی تھی۔ اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

یاد آیا مجھے گھر دیکھ کے دشت ؎ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

۹۱:۔ غالب نامہ صفحہ ۱۵۰

۹۲:۔ " " ۲۷

۹۳:۔ " " ۱۵۱

یہ خیال رہے کہ یہ شعر غالب سے پہلے کا کہا ہوا ہے[91]

یا بعض حضرات نے نہایت جستجو سے غالب کی بعض غیر مطبوعہ غزلیں ڈھونڈ نکالیں۔ ان میں سے ایک کا ایک شعر سنیئے :۔

مزا ملے کہو کیا خاک ساتھ سونے کا ؎ رکھے جو بیچ میں وہ شوخِ سیمتن تکیہ

ظاہر ہے کہ ایسی تحقیقیں غالب کی شہرت میں ممد و معاون نہیں ہو سکتیں۔

اسی طرح مرزا محمد عسکری صاحب نے مرزا کے رقعات میں سے وہ رقعات جن میں ادب اور علم کے متعلق کوئی بات تھی الگ کر کے مقدمہ، دیباچہ ضمیمہ اور حاشیہ کے ساتھ شائع کئے ہیں۔ لیکن اس تحقیق کا نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا کو معلوم ہو گیا کہ مرزا کو اپنے اقوال کی تردید اور اپنے معروضات کی تکذیب میں باک نہ تھا[92] یا یہ کہ وہ اس قدر مرنجان مرنج اور سب کی

---

[91] :۔ تذکرہ شمیم سخن از مولوی عبدالحیٔ صاحب صفا بدایونی

[92] :۔ رقعہ نمبر ۲۹ میں فرمایا ہے :۔ "یہ نہ سمجھئے کہ بڑا رونا رزق کا ہے۔ جب معاش مقرر ہو تو پھر غم کیا ہے۔ نا صاحب یہ باتیں جانوروں کی ہیں کہ کچھ کھا لیا پی لیا بین سے سو رہے۔ آدمی عموماً اور صاحبانِ ننگ و ناموس خصوصاً باوجود فراغِ معاشی جانگداز بلاؤں میں مبتلا ہیں" رقعہ ۱۴۹ میں کہتے ہیں" دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا اور گم نام جئے تو کیا۔ کچھ وجہ معاش ہو اور کچھ صحتِ جسمانی۔ باقی سب وہم ہے اے یارِ جانی، ہر چند وہ بھی وہم ہے مگر میں ابھی اسی پایہ پر ہوں"۔ اس کے علاوہ معیارِ زبان و زباندانی اسناد، آراء، ادبا کے متعلق جو جو مرزا نے صفحہ صفحہ پر بدلے ہیں ان کا مفصل ذکر اس مضمون کے آخر میں صفحہ ۹۱ وغیرہ پر کیا گیا ہے۔ جہاں یہ ملاحظہ فرمایا جا سکتا ہے۔

بھلائی چاہنے والے نہ تھے جیسا کہ یادگار پڑھنے سے اندازہ ہوتا تھا بلکہ ان کے اعتراض کے نشتر کی قطع برید خاصی عام تھی - اور اس میں وہ حق و انصاف کا بھی زیادہ پاس نہیں رکھتے تھے۔[1]

لیکن جس چیز نے مرزا غالب کو سب سے زیادہ عریاں کیا وہ تو وہ تحقیقات ہیں جو ان کی سوانح حیات میں کی گئی ہیں۔ غالب پرست سوانح نگار چاہتا ہے کہ ہر خوبی مرزا میں "ثابت" کر دکھائی جائے۔ لیکن واقعات ایک قدم بھی ساتھ نہیں دیتے۔ یوں تو تقریباً ساری معروضہ خوبیاں خود ان سوانح نگار حضرات کی تحقیقات سے ہو سکتی ہیں لیکن مثال کے طور پر حسب ذیل غالباً کافی ہوں :-

مرزا خود فرماتے ہیں ع نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

سوانح نگاروں نے بھی مرزا کی خودداری اور بے نیازی کو باہتمام بیان کیا ہے۔

---

[1] خواجہ غلام غوث بے خبر کے نام کے خط میں مرزا نے میر انیس کے شعر سے ہی سہل ممتنع یہ کلام ادق مرا + برسوں پڑھے تو یاد نہ ہوئے سبق مرا + کا مطلب بتایا ہے۔ مرزا محمد عسکری صاحب مولف "ادبی خطوط غالب" اس کے متعلق فرماتے ہیں :- "یہ شعر میر انیس مرحوم کا مرزا صاحب کے اعتراض بے جا کا گھائل ہے + مرزا صاحب نے اس کے معنی سمجھانے میں غلطی کی اور اس پر اعتراض وارد کرنے میں زیادتی کی ہے" صفحہ ۹۰ + غصہ میں دانستہ غلط بھی فیصلے دیتے تھے اسی کتاب کے صفحہ ۱۵۹ پر مرزا تفتہ کے نام کے خط میں فرماتے ہیں "حلقہ زا کی زے پر نقطہ نہ تھا میں نے غصہ میں لکھا کہ نہ حلقہ را درست نہ حلقہ زا درست" (ورنہ یوں حلقہ زا درست ہے)۔ عبدالواسع۔ مولوی غیاث الدین۔ قتیل وغیرہ پر جو زبردستی کے اعتراض کئے گئے ہیں ان کا ذکر آگے آئے گا۔

'یادگار' کے مطالعہ نے یہ نقش پیدا کرنے میں بڑی مدد دی تھی۔ لیکن نئی تحقیق کا بھلا ہو کہ اس واہمہ کا تار پود بکھیر کر رکھ دیا۔ اصل یہ ہے کہ مرزا غالب کی قصیدہ خوانی بھٹی تک پہنچ گئی تھی۔ جہاں ذرا سے بھی فائدے کی امید نظر آتی تھی یہ جھٹ اپنا قصیدہ پیش کر دیتے تھے۔ اپنا مسلک خود بیان فرماتے ہیں "اشعارِ تازہ مانگتے ہو کہاں سے لاؤں .... گورنمنٹ کا بھاٹ تھا بھٹی کرتا تھا۔ خلعت پاتا تھا۔ خلعت موقوف بھٹی متروک[۱]" + ہندوستانیوں میں دلّی میں بادشاہ سلامت اور ولی عہد لکھنؤ میں بادشاہ غازی الدین حیدر، شاہ نصیر الدین حیدر، امجد علی شاہ، واجد علی شاہ، معتمد الدولہ وزیر اور روشن الدولہ وزیر، رام پور میں نواب یوسف علی خاں، نواب حامد علی خاں اور نواب کلب علی خاں، حیدر آباد میں سر سالار جنگ اور شمس الامراء، ٹونک میں نواب وزیر الدولہ، الور میں راؤ راجہ بنی سنگھ اور راجہ شیو دھیان سنگھ، پٹیالہ میں راجہ نرنید ر سنگھ، کالپی میں نواب انوار الدولہ، فرخ آباد میں نواب نصیر الدولہ، لوہارو میں نواب امین الدین احمد خاں، مہاراجہ جے پور۔ مہاراجہ گوالیار، میر ابراہیم علی خاں سورتی وغیرہ غرضکہ ہر ممکن دروازہ کھٹکھٹایا۔ پھر اگر انعام نہ پاتے تھے تو تقاضے کئے جاتے تھے۔ اور صلہ نہ ملنے پر آزردہ ہوتے تھے۔ اور اس کا برسوں چرچا رہتا تھا۔ نواب انوار الدولہ کے پاس سے قصیدہ کی کوئی رسید نہ ملی تو ان کو القاب میں 'امید گاہ' کے بجائے

---

[۱] بنام نواب علاؤ الدین لوہارو۔

'امید گاہ' بکافِ فارسی لکھا۔ شمس الامرا اور سر سالار جنگ کے پاس سے رسید نہ آنے پر کئی دفعہ منشی حبیب اللہ ذکا حیدرآبادی کو لکھا۔ ٹونک سے انعام نہ ملا تو برہم ہو گئے۔ اور وزیر الدولہ کی ہجو تک لکھ ڈالی[91] لیکن غالب کچھ نہ تھے اگر اول درجہ کے موقعہ شناس نہ تھے۔ ہندوستانیوں سے تو زیادہ سے زیادہ کچھ روپیہ کی امید تھی ان کا جذبۂ جاہ طلبی ہندوستان کے درباروں سے مطمئن ہونے والا نہ تھا۔ وہ وقت ہندوستانیوں کے ادبار کا تھا۔ انگریزوں کو عروج تھا۔ غالب نے شاید ہندوستانی شعرا میں سب سے پہلے انگریزوں کی مدح سرائی شروع کی اور اس سلسلے میں ملکۂ وکٹوریا سے لے کر معمولی ریذیڈنٹ اور سکریٹری بلکہ کلکٹر تک کم و بیش پندرہ انگریزوں کی شان میں اٹھارہ قصائد لکھے[92] انگریزوں کے پاس سے جواب آنے سے اور ان کی خوشنودی سے غالب کو بڑی مسرت حاصل ہوتی تھی[93] بعض دفعہ خاصی تذلیل بھی ہو جاتی تھی لیکن وہ باز نہ آتے تھے[94] نوابوں اور حاکموں سے گذر کر مرزا کو اپنے دوستوں سے

---

[91] غالب از مہر صفحہ ۲۷۷

[92] غالب از مہر صفحہ ۳۶۹ و ۳۷۰

[93] ادبی خطوط غالب صفحہ ۳۳

[94] غدر کے بعد غالب نے ملکہ وکٹوریا اور حکام عالی شان کی تعریف میں قصائد لکھ کر حکام دہلی کی معرفت ارسال کئے۔ لیکن ۱۷ مارچ ۱۸۵۸ء کو کمشنر دہلی نے یہ لکھ کر واپس کر دیا کہ ان میں سوائے ستائش اور مدح کے اور کچھ نہیں (دیکھیے [illegible])

بھی استمدادِ زر میں تکلف نہ تھا مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں "سو دو سو میں میری پیاس نہیں بجھتی۔ تمھاری ہمت پر سو ہزار آفریں ہے۔" منشی ہیش داس نے اکثر شراب مہیا کی۔ قاضی القضات ولایت حسین صاحب نے تین سو روپیہ ایکبار بھیجے۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں پچاس روپیہ ماہوار دیا کرتے تھے۔ نواب غلام بابا سورتی نے گھڑی اور روپیہ بھیجا۔ جے پور سے ٹھاکر صاحب بھیجتے رہتے تھے۔ اور پھر یہ سب تو وہ فتوحات ہیں جن کا علم خود مرزا کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ کتنی کچھ ایسی ہوتی ہونگی جن کا اب پتہ نہیں چل سکتا۔ خواجہ غلام غوث بے خبر کو لکھتے ہیں "قبلہ کبھی آپ کو یہ بھی خیال آتا ہے کہ کوئی ہمارا دوست جو غالب کہلاتا ہے وہ کیا کھاتا پیتا ہے اور کیونکر جیتا ہے۔ پنشن قدیم اکیس ماہ سے بند اور میں سادہ دل فتوح جدید کا آرزو مند"

مصرعہ متذکرہ بالا میں "نہ ستائش کی تمنا" بھی محض برائے بیت ہے۔ نواب علاء الدین احمد خاں نے مرزا سے پتہ کے لئے محلہ کا نام دریافت کیا۔ فرماتے ہیں "قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں ایک شخص ہے (یعنی غالب) کہ اس کی عزت و نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت و محقق ہے

(بقیہ صفحہ ۳۱) پھر ۱۸۶۰ء میں قصیدہ سال نو جسکا پہلا شعر یہ ہے ؎

زسال نو دگر آبے بروئے کار آمد ۔ ہزار و ہشت صد و شست در شمار آمد

لارڈ کیننگ کی مدح میں لکھ کر پیش کیا لیکن وہ بھی مع اس حکم کے واپس آیا کہ اب یہ چیزیں ہمارے پاس نہ بھیجا کرو (غالب نامہ صفحہ ۸۶)۔

اور تم صاحب بھی جانتے ہو۔ مگر جب تک اس سے قطع نظر نہ کر لو اور اس مسخرے کو گمنام اور ذلیل نہ سمجھ لو تم کو چین نہ آئیگا"[۵۱] یا پھر کوین لوریٹ مقرر ہونے کے لئے اس قدر تگ ودو[۵۲] نہ کرتے درآں حالیکہ گو نام کو ہی سہی ابھی دلی کے قلعے کا دربار قائم تھا۔ اصل یہ ہے کہ لفٹنٹ گورنر بہادر کا دربار اور خلعت ان کو دولٹی سے بھی زیادہ عزیز تھا۔[۵۳]

مرزا کی اسلام دوستی اور وطن پرستی کا بھی یہی حال ہے۔ اپنی خلعت کی عنداری میں انھوں نے ایک قصیدہ سرجان میکلوڈ فنانشل کمشنر پنجاب کی خدمت میں پیش کیا اس کا ایک شعر یہ ہے ؎

ہے یہ دعا کہ زیرِ نگیں آپ کے رہے ٭ اقلیم ہند سند سے تا ملکِ روم و شام

یا جب سرسید علیہ الرحمتہ نے آئینِ اکبری کی تصحیح کر کے اس کے چھاپنے کا ارادہ کیا اور غالب سے تقریظ لکھنے کی خواہش ظاہر کی تو تقریظ لکھنے میں غالب نے اس قدر انگریز پرستی کا ثبوت دیا کہ سرسید جیسے انگریز پرست کے گلے سے بھی وہ تقریظ نہ اتر سکی اور انھوں نے اس کو داخلِ کتاب نہیں کیا۔[۵۴] یا پھر یہ حقیقت کہ جب انگریزوں کا یہ فیصلہ معلوم ہوا کہ وہ ابوظفر بہادر شاہ کے بعد مغلی دربار کو قائم نہ رہنے دیں گے اور ولی عہد "بادشاہ" کا لقب

---

۵۱ ادبی خطوط غالب صفحہ ۴۴

۵۲ غالب نامہ صفحہ ۱۴۸

۵۳ ادبی خطوط غالب صفحہ ۴۴

۵۴ غالب نامہ صفحہ ۱۴۹

اختیار نہ کر سکے گا اور بجائے دلّی کے اس کو مہرولی میں رہنا ہوگا تو غالب نے اپنے ولی نعمت کے اس زوال پر آنسو بہانے کی بجائے جھٹ دوسرا ٹھکانا مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ بادشاہ سلامت بیمار ہوئے تو مرزا غالب نے منشی ہیرا سنگھ کو خط میں لکھا "از شب عید خاقان رنجور است تا حال دیگر چہ روئماید و من کہ در سایہ دیوارش غنودہ ام چہ رود" اور ادھر فرمانروائے انگلستان ملکہ وکٹوریا کی تعریف میں ایک فارسی قصیدہ لکھ کر لارڈ کیننگ کی معرفت ولایت بھجوایا۔ اور اس کے ساتھ ایک عرضداشت بھی تھی کہ روم وایران کے بادشاہ شعرا پر بڑی بڑی عنایتیں کرتے ہیں اگر شاہنشاہ انگلستان مجھے خطاب دے اور خلعت اور پنشن سے سرفراز کرے تو عجب نہ ہو[۵۱]۔ غدر کے متعلق فرماتے ہیں "انگریزوں کی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے کوئی میرا امیدگاہ تھا اور کوئی میرا شفیق"۔ پھر جب انگریزوں نے دوبارہ دلی فتح کر لی تو مرزا غالب نے مبارکباد کا قصیدہ لکھا[۵۲] اور اپنے گھر میں چراغاں کیا[۵۳]۔

یا مثلاً یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مرزا غالب کو اپنی بیوی سے کمال محبت تھی اور دیگر متعلقین سے ان کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ افسوس کہ واقعات یہاں بھی کچھ اور کہانی سناتے ہیں۔ مرزا غالب کے

---

۵۱ غالب نامہ صفحہ ۷۲

۵۲ " " ۸۸

۵۳ غالب از مہر صفحہ ۲۰۱

چچا نصراللہ بیگ کی شادی نواب احمد بخش کی بہن سے ہوئی تھی ۔ نصراللہ بیگ نواب احمد بخش کی معیت ہی میں لڑائی میں کام بھی آئے تھے۔ اسی لئے نواب موصوف کو ان کے پسماندگان کا بہت خیال تھا یہی وجہ تھی کہ وہ غالب اور ان کے چھوٹے بھائی یوسف مرزا کو کم عمری ہی میں دلّی لے آئے ۔ اور غالب کی شادی تیرہ برس کی عمر ہی میں اپنے بھائی نواب الٰہی بخش معروف کی چھوٹی لڑکی سے کر دی ۔ اس کے کچھ ہی مدت بعد غالب مستقلاً دلی میں آ بسے ۔ اور پھر ایک بار بھی کبھی اکبرآباد نہ گئے۔ اکبرآباد میں وہ اپنی ننھیال کی خوش حالی کی وجہ سے بہت آرام سے رہتے تھے ۔ دلی میں بھی شروع میں اس آرام میں فرق نہ آیا ہوگا ۔ ورنہ کیوں مستقل طور پر یہاں رہنا گوارہ کرتے ۔ غرضکہ اس میں شک نہیں کہ دلّی کے اس تعلق سے غالب کو بے اندازہ فائدہ پہنچا ۔ آرام و آسائش. روپیہ پیسہ ۔ گھر بار سرپرستی ۔ تربیت ۔ شاعری میں صحیح رہ نمائی اور پھر شہرت سب اس دلی کے تعلق ہی کی بدولت ان کو میسر آئی۔ شیخ محمد اکرام صاحب فرماتے ہیں " لیکن جب مرزا دلی آئے اور مولانا فضل حق اور دوسرے مسلّمہ استادوں نے انھیں ان کے اشعار کے حسن و قبح سے آگاہ کیا تو مرزا کو ان کے علم و فضل کے آگے سر جھکانا پڑا اور اس طرح اپنی شاعری کا رخ بدلا[۱۰]" ورنہ اس میں شک نہیں کہ بقول میر مرزا غالب مہمل ہی بکتے رہتے ۔ اس سب کے باوجود بیوی اور سسرال والوں کو انھوں نے کچھ

---

[۱۰] غالب نامہ صفحہ ۲۷

اچھی طرح یاد نہیں کیا۔ بلکہ ہمیشہ دلی کو حراست اور بیوی کو بیڑی کہا جس کے کٹنے کی دعا مانگنے سے وہ کبھی نہ چوکتے تھے۔ مرزا تفتہ کے نام کے خط میں فرماتے ہیں :۔ "امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں۔ اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندہ گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندہ ٹوٹتا ہے نہ دم نکلتا ہے۔" میر مجروح کے نام کے خط میں لکھتے ہیں :۔

"وبا تھی کہاں جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا زیادہ۔ ایک چھیاسٹھ برس کا مرد اور ایک چونسٹھ برس کی عورت ان دونوں میں سے کوئی مرتا تو ہم جانتے کہ ہاں وبا آئی۔ تف بریں وبا"

تبدیلئ مکان کے سلسلے میں ایک نیا مکان دیکھا۔ مردانہ حصہ پسند آیا۔ زنانہ حصہ دیکھنے کے لئے بیگم کو بھیجا۔ واپس آکر انھوں نے کہا لوگ اس مکان میں بلا بتاتے ہیں۔ فرمایا "کیا تم سے زیادہ کوئی اور بھی بلا ہے [1]"

ایک جگہ فرماتے ہیں :۔

"بھائی میرا ذکر سنو۔ ہر شخص کو غم موافق اس کی طبیعت کے ہوتا ہے۔ ایک تنہائی سے نفور ہے ایک کو تنہائی منظور ہے۔ تاہل میری موت ہے۔ میں کبھی اس گرفتاری سے خوش نہیں رہا۔"

---

[1] غالب کی شوخیاں صفحہ ۱۴۸

امراؤ سنگھ کی بیوی کے تعزیت کے خط میں حکیم سنائی کے حدیقہ میں سے اوحدی کرمانی کا یہ قطعہ بھی نقل کیا ہے

پسرے با پدر بہ زاری گفت ؛ کہ مرا یار شو بہ بہرہ جفت
گفت با باز نا کن و زن نے ؛ پند از خلق گیر و از من نے
در زنا گر بگیر دت غم نے ؛ ہبلا کو گرفت چوں تو بسے
زن کنی ہر گزت رہا نہ کند ؛ در تو بگذارش چہا نہ کند

مرزا حاتم علی مہر کو لکھتے ہیں :-

"میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی۔ اوقات جاودانی ہے اور اس نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے اس تصور سے جی گھبراتا ہے۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔"

یہی نہیں کہ نجی طریقہ پر وہ اپنی تاہل کی زندگی کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار جب اور جہاں موقعہ ملتا تھا کرتے رہتے تھے۔ بلکہ وہ اس سے اس قدر دل برداشتہ تھے کہ شاعری میں بھی اکثر جگہ اس زندگی کی تلخی رونما ہو جاتی تھی۔ سبد چین میں فرماتے ہیں :-

گیرکہ در روز حشر چوں تو بعقتی ؛ بر سر دوزخ نہند تیرہ نہنن
لیک نہ باشد دراں مضیق مصیبت ؛ در طلب نان و جامہ کشمکش از زن
لیک نہ باشد دراں مقام صعوبت ؛ شور تقاضائے نار دانے مہاجن

ایک رباعی میں فرماتے ہیں :-

اے آنکہ برائے کعبہ رُوئے داری ؛ دانم کہ گزیدہ آرزوئے داری
زین گونہ کہ تند مے خرامی دانم ؛ درخانہ زن ستیزہ خوئے داری

ایک اور رُباعی سنیئے :-

آن مرد کہ زن گرفت دانا نہ بود ؛ از غصہ فراغتش ہما نا نہ بود
دارد بہ جہاں خانہ وزن نیست درو ؛ نازم بخدا چرا توانا نہ بود

ایک قطعہ ملاحظہ فرمائیے :-

بہ آدم زن بہ شیطاں طوق لعنت ؛ سپروند از رہ تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیری طوق آدم ؛ گراں تر آمد از طوق عزازیل

پھر یہ محض زبانی واویلا نہ تھا۔ بلکہ اس بیڑی کو کاٹنے کی انھوں نے کوشش بھی کی یہ تصفیہ کیا کہ بیوی کو لوہارو بھیجا جائے اور خود آزادانہ زلیست بسر ہو۔ انکے ہی الفاظ میں سنیئے جو انھوں نے نواب علاؤالدین احمد خاں کو ایک خط میں لکھے :-

"تمھارے والد ماجد اور تمھاری جد ماجدہ سے اور تمھارے عم عالی مقدار سے کہہ چکا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ میرے بیوی بچوں کو کہ یہ تمھارے ہیں مجھ سے لے لو کہ میں اب اس بوجھ کا متحمل نہیں ہو سکتا میرا قصد سیاحت کا ہے۔ پنشن اگر کھل گئی تو وہ اپنے صرف میں لایا کروں گا۔"

غالب کی بیوی بھی مجبوراً اس پر راضی ہو گئی تھیں۔ لیکن پھر کسی وجہ سے یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔

غرضکہ یہ تھے مرزا غالب کے تعلقات اپنی بیوی کے ساتھ۔ یوں طبعاً بھی دونوں ایک دوسرے سے کوسوں دُور تھے۔ یہ شاعر آزاد منش۔

ستم پیشہ ڈومنی اور شراب سے دل بہلانے والے۔ وہ خشک، مذہبی متشرع اور پرہیزگار۔ یہاں تک کہ انھوں نے غالب کے کھانے کے برتن تک الگ کر رکھے تھے۔ پھر یہ اختلاف 'جوانی دیوانی' کے زمانے ہی میں نہ تھا بلکہ آخر عمر تک بھی جب کہ شاید میاں بیوی کی نا اتفاقی کا امکان ہی نہیں رہتا اور ایک دوسرے کا خواہ مخواہ پرستار ہو جاتا ہے۔ اس وقت بھی غالب بیوی سے اتنے ہی عاجز تھے جتنے کہ شروع میں۔ اس بحث سے یہ مطلب نہیں کہ مرزا غالب اپنی بیوی کے ساتھ ناروا سلوک کرتے تھے یا اپنی ذمہ داری سے بے خبر تھے۔ لیکن فرض کی ادائیگی اور دل کی محبت میں جو فرق ہے وہ ایسا باریک نہیں کہ آسانی سے سمجھ میں نہ آجائے۔ پھر ان حالات میں صرف اس بنیاد پر کہ غالب نے ایک بار رام پور سے حکیم ظہیر الدین کو خط لکھا کہ وہ بیگم سے دریافت کر لیں کہ نواب شہاب الدین خاں نے ماہانہ (پچاس روپیہ) دے دیا یا نہیں۔ یا یہ کہ وہ دن کا کھانا گھر کے اندر جا کر بھی کھاتے تھے۔ یا جب دلی سے باہر جاتے تھے تو گھر کی خبر گیری کے لئے دو چار بار رائے چھجمل یا حکیم غلام نجف خاں کو لکھا یہ "ثابت" کر دینا کہ مرزا غالب کو "بیگم صاحبہ سے محبت تھی"[۵۱]، ہمیں خبر نہیں کیسا استدلال ہے۔ یوں دیکھئے تو بیوی سے دل نہ ملنا بھی کوئی جرم یا گناہ نہیں۔ لیکن چونکہ بیوی سے محبت کرنا مستحسن چیز ہے اس لئے سوچا کہ یہی کیوں نہ "ثابت" کر دیا جائے کہ مرزا غالب کو

---

۵۱ غالب از مہر صفحہ ۴۷۔

بیوی سے کمال محبت تھی۔

بیوی کے علاوہ اور سب متعلقین سُسُنبی سے بھی ان کے تعلقات ایسے ہی بیزاری کے تھے۔ سسرال میں پڑے ہوئے تھے۔ لیکن ہمیشہ سب سے دل برداشتہ۔ ان کے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف بڑے متقی بزرگ تھے۔ ایک بار نواب موصوف نے غالب کو شجرہ نقل کرنے کو دیا۔ غالب نے دانستہ ہی کو غلط سلط نقل کر دیا۔ کہ پھر بے چارے نواب کو کسی کام کو کہنے کی جرأت نہ ہوئی[1] مرتوں کے تعلقات اپنے برادر سُسُنبی مرزا علی بخش رنجور سے گو شروع میں خراب نہ تھے۔ لیکن آگے چل کر ان سے بھی دل گرفتہ ہو گئے تھے۔ لکھتے ہیں :۔

"سبحان اللہ، گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانا اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں۔ ہاں صاحب گولہ انداز (مرزا معین الدین) کا بہنوئی (نواب ضیاء الدین احمد) مددگار ہے اور شاعر (غالب) کا سالا (مرزا علی بخش) بھی جانبدار نہیں۔"

مختصر یہ کہ وہ سب ہی سے خلاف اور خفا تھے۔ نواب انوار الدولہ کالپی کو خط میں لکھتے ہیں :۔

"میرا ہم قوم تو سراسر قلمرو ہند میں نہیں۔ سمرقند میں دو چار یا دشتِ قبچاق میں سو دو سو ہوں گے۔ مگر اقربائے سببی ہیں۔ سو پانچ برس کی عمر سے ان کے دام میں اسیر ہوں۔ اکسٹھ برس ستم اٹھائے سو

---

[1] غالب از مہر صفحہ ۲۷۶

گردہم شرح ستم ہائے عزیزان غالبؔ   رسم امید ہمانا زجہاں برخیزد"

اصل میں وہ انتہائی خود غرض اور خود پسند آدمی تھے۔" اور تو اور انھوں نے اپنے بھائی مرزا یوسف اور ان کے اہل دعیال کی غدر اور اس کے بعد کوئی خاص مدد نہ کی۔ غدر کی مصیبتیں مرزا یوسف کو تن تنہا جھیلنی پڑیں اور جب وہ مر گیا تو معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نماز جنازہ میں بھی شریک نہ تھے۔ اس کی وفات کے بعد مرزا نے اپنی بھتیجی اور بھاوج وغیرہ کے لئے کیا کیا اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ لیکن ان کے ایک اردو خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم تین سال تک اپنی بھتیجی کو ایک پائی نہ بھیجی (حالانکہ مرزا کی اپنی بسر اوقات بیشتر چچا کی پنشن پر تھی) بے شک یہ غیر معمولی وقت تھا اور مرزا اپنی مصیبتوں میں گرفتار تھے۔ لیکن ان حالات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہی خیال ہوتا ہے کہ ان کی اپنی ضرورتیں اتنی بڑھی ہوئی تھیں کہ وہ کسی کی خاطر اپنے آرام کو قربان نہیں کرتے تھے۔ اور نہ اپنے تئیں خطرے میں ڈالتے تھے[۹]۔ مرزا حاتم علی مہرؔ کے نام کے خط میں انھوں نے اپنے نقطہ نظر کی خود اس طرح ترجمانی فرمائی ہے:-

"شباب میں ایک مرشد کامل نے نصیحت کی ہے کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں۔ ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو کھاؤ مزے اڑاؤ۔ مگر یاد رہے مصری کی مکھی بنو۔ شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس پر عمل رہا ہے۔"

اخلاق کا یہ عالم کہ ولیم فریزر کے قتل کے معاملے میں نواب شمس الدین خاں

۹۔ غالب نامہ صفحہ ۱۵۶، ۱۵۷

والئے فیروزپور کی بوجہ دشمنی چغلی کھائی[1] اور نواب موصوف کو پھانسی ہوئی۔ یہ مانا کہ غالباً اس قتل میں نواب موصوف کا ہاتھ تھا لیکن پھر بھی غالب کا یہ فعل اپنی جگہ کسی طرح بھی مستحسن نہ تھا۔ غالب کے ابن الوقتی کے بھی خاصے دلچسپ مظاہرے نظر آتے ہیں۔ برہان قاطع والے قضیہ میں غالب کی کوشش تھی کہ مخالفین کے جوابات خود لکھیں اور دوستوں کے نام سے چھپوائیں۔ یا کم از کم کوئی ان کا جاننے والا ان کے خلاف نہ لکھے۔ اس حالت میں سُنا کہ خواجہ غلام غوث بے خبر ان کے خلاف کچھ لکھنے والے ہیں۔ پھر جب اطمینان ہو گیا کہ ایسا نہیں ہے تو انھیں نہایت نیازمندانہ خط لکھا۔ لکھتے ہیں:۔

"بلا مبالغہ کہتا ہوں ستر ہزار آدمی نظر سے گذرے ہوں گے زمرہ خواص میں سے۔ عوام کا شمار نہیں۔ دو مخلص صادق الولاد دیکھے۔ ایک مولوی سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ دوسرا منشی غلام غوث بے خبر سلمہ اللہ تعالےٰ"

ادھر مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں:۔

"مجھے اس پر ناز ہے کہ میں ہندوستان میں ایک دوست صادق الولاد رکھتا ہوں جس کا ہرگوپال نام اور تفتہ تخلص ہے"

اسی طرح قدر بلگرامی کو لکھا کہ محرق کا جواب اپنے نام سے چھپوا دو، لکھ میں دونگا۔ اور پھر اس ارادے سے کہ قدر پر اچھا اثر پڑے اور شیعیت

---

[1] غالب از مہر صفحہ ۴۴

کا اشتراک ہمدردی پر آمادہ کر ہی دے خط کے خاتمہ پر اپنے نام کے بعد "اثنا عشری حیدری" خصوصیت کے ساتھ لکھا[۹۱]۔ سچ ہے ؎ غالب

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال ء رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

اخلاق و عادات تو الگ رہے، ان کی بذلہ سنجی اور ذکاوت کی شگفتہ مثالیں جو یادگار کے ذریعہ ہم تک پہنچی تھی بعض بعض وہ بھی غلط ثابت ہو رہی ہیں۔ خلاً یادگار میں ہے کہ کسی نے کہا کہ واحد متکلم کے "آپ" کا لفظ "تئیں" سے فصیح تر ہے۔ غالب نے کہا کہ اس میں یہ قباحت ہے کہ اگر بالفرض مجھے براہ خاکساری اپنے تئیں احمق کہنا ہو تو میں کہوں گا کہ "میں آپ کو احمق سمجھتا ہوں" اور مشکل یہ ہو گی کہ آپ اپنے لئے سمجھیں گے لیکن ادبی خطوط غالب میں غالب کا ایک خط یوں شروع ہوتا ہے ؛۔

"تئیں کا لفظ متروک مردود و قبیح و غیر فصیح۔ یہ پنجاب کی بولی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے لڑکپن میں ایک اصیل ہمارے ہاں نوکر رہی تھی۔ وہ تئیں بولتی تھی تو بیبیاں اور لونڈیاں سب اس پر ہنستی تھیں[۹۲]"

اسی طرح رتھ کا لطیفہ کہ کسی نے غالب سے پوچھا رتھ مذکر ہے یا مؤنث۔ فرمایا اگر اس میں عورتیں بیٹھی ہوں تو مؤنث اور اگر مرد تو مذکر لیکن میر مجروح کے نام کے خط میں لکھتے ہیں ؛۔

"رتھ میرے نزدیک مذکر ہے[۹۳]"

---

۹۱ ادبی خطوط غالب صفحہ ۲۱۵

۹۲ " " " " ۲۱۶

۹۳ " " " " ۱۹۷

مختصر یہ کہ ان ژرف نگاہیوں اور موشگافیوں کی بدولت ہر وہ چیز نظروں کے سامنے آگئی جو نہ آنی چاہئے تھی۔ اور جسے ہماری عقل ہی دور سے نہیں بلکہ نہایت عام قسم کے انسانوں سے منسوب کرتی ہے۔ بلکہ بعض باتیں تو عام آدمی سے بھی عموماً سرزد نہیں ہوتیں۔ مثلاً ان کی دریدہ دہنی کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

"بھائی شہاب الدین خاں واسطے خدا کے یہ تم نے اور حکیم نجف خاں نے میرے دیوان کا کیا حال کر دیا ہے۔ یہ اشعار جو تم نے بھیجے ہیں خدا جانے کس ولدالزنا نے داخل کر دئے ہیں۔ دیوان تو چھاپے کا ہے متن میں اگر یہ شعر ہوں تو میرے اور اگر حاشیہ پر ہوں تو میرے نہیں۔ بالفرض اگر یہ شعر متن میں پائے بھی جائیں تو یوں سمجھنا چاہئے کہ کسی ملعون۔ زن جلب نے اصل کلام کو چھیل کر یہ خرافات لکھ دئے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جس مفسد کے یہ شعر ہیں اس کے باپ پر اور دادا پر اور پردادا پر لعنت اور وہ ہفتاد پشت تک ولدالحرام۔ اس کے سوا اور کیا لکھوں[۵۱]"

نئی تحقیقات کے سلسلے میں چند ایسی بھی باتیں منظر عام پر آگئی ہیں جن پر اب پردہ نہیں ڈالا جا سکتا۔ اور جن کو انصاف بالائے طاعت کے اصول پر پرکھنا لازم ہو گیا ہے۔

القصہ یہ ہے اس مکروہات کا طومار جو غالب کے متعلق نئی تحقیق کا نتیجہ ہے۔ اور چونکہ اب اس پر کسی طرح پردہ نہیں پڑ سکتا اس لئے غالب کے پرستاروں نے اس سب خرافات کو اس دلیل اور اس وجہ سے ماننا اور

---

[۵۱] ادبی خطوط غالب صفحہ ۲۴۷

منوانا شروع کر دیا ہے کہ یہ سب گفتۂ غالب ہے اس لئے اس میں کلام کی گنجائش نہیں۔ مولانا غلام رسول صاحب مہر۔ بی۔ اے کی تازہ تصنیف 'غالب' بھی اسی قبیل کی ایک کوشش ہے۔ اس کی زبان پاکیزہ اور تفصیلات بسیط لیکن افسوس کہ حالات و واقعات پر صحیح تبصرہ و تنقید نہیں ہے۔ بلکہ ہر جگہ اور ہر بات میں صرف غالب کا پلّہ بھاری رکھنے کے علاوہ اور کوئی خاص کوشش تحقیق حق میں نہیں کی گئی ہے۔ نہ متضاد باتوں کا صحیح مواز نہ کر کے حکم لگایا گیا ہے نہ ادعائے غالب کو سمجھانے اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ بلکہ جہاں اس قسم کا کوئی معاملہ آ بھی گیا ہے تو مہر صاحب نے بھی مخالف کی تضحیک فرمائی ہے تردید کی کوشش بھی نہیں کی ہے۔ مثلاً شاہزادہ جواں بخت کے سہرے کے سلسلے میں جو بدمزگی سی غالب اور ذوق کے درمیان رونما ہو گئی تھی۔ اس سلسلے میں کوئی کوشش اس قسم کی نہیں کی گئی ہے کہ اگر واقعی ذوق کا سہرا مقابلتاً کمزور تھا تو ان کمزوریوں کو دکھائیں۔ بلکہ محض اس پر اکتفا کیا گیا ہے کہ حقارت سے ذوق کا ذکر کر دیا جائے۔ فرماتے ہیں۔ "ذوق کی غلط فہمی اور غلط اندیشی کے باعث جو صورت حالات پیدا ہو گئی تھی اس پر غالب نے ایک فارسی قطعہ بھی ذوق کو مخاطب کر کے لکھا تھا۔ اس میں فرماتے ہیں :-

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ	بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است
راست می گویم واز سر راستی نتواں کشید	ہر چہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است[۱] "

---

[۱] غالب از مہر صفحہ ۳۵۴

باہمہ کورانہ تعریف و توصیف کا ایک لطیفہ سنئے ۔ آج تک بھی
اُردو کتب کا طبع و شائع کرانا عام طور پر کچھ منفعت بخش مشغلہ نہیں ہے ۔ بلکہ
ناشرین کتب سے اگر واقعی دریافت کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ شاید ہی
سینکڑوں میں کوئی ایسی کتاب نکلتی ہے جس میں لاگت وصول ہو جاتی
ہے ۔ اسی لئے مطبع والے کسی کتاب کو اپنے خرچ پر چھاپنے کے لئے تیار
نہیں ہوتے ۔ غالب کے زمانے میں تو حالت اور بھی سنگین ہوگی ۔ وہ تو یوں
کہئے کہ غالب ہی کی کتابیں تھیں کہ مطبع والے عام طور پر اس شرط پر
چھاپنے پر تیار ہو جاتے تھے کہ مرزا کتاب چھپنے کے بعد ایک معین تعداد
نسخے خریدیں ۔ غالب اپنی جگہ اس کا یہ انتظام کرتے تھے کہ کبھی نواب
صاحب رام پور سے اس کے لئے روپیہ لے لیتے تھے[1] کبھی نواب
میر غلام بابا سے[2] کلیات فارسی کی طباعت پر نواب علاؤالدین نے دس
جلدیں خریدیں ۔ بعض دفعہ مطبع والے بغیر کسی شرط کے بھی کوئی سی کتاب
چھاپ دیتے تھے مثلاً غالب کا اُردو دیوان ۔ غرضکہ یہ آپس کا انتظام تھا
دستنبو کی طباعت کے سلسلے میں شرط یہ تھی کہ غالب پچاس نسخے خریدینگے
یہ شرط رائے امید سنگھ صاحب اندور والے نے پوری کردی اور پچاس نسخے
خرید کر پچیس خود رکھے اور پچیس غالب کی نذر کر دئے ۔ اب اس کے بعد
غالب نے سولہ نسخے وقتاً فوقتاً اور خریدے جن کے متعلق انھوں نے

---

[1] اُردوئے معلی صفحہ ۱۱۳
[2] " " " ۱۷ و ۲۳

ایک خط میں لکھا ہے کہ :-

"سولہ جلدیں اور لے چکا ہوں مگر نقد۔ قرض میں نے نہیں منگوائیں"
بس اس بات کو مہر صاحب لے اڑے۔ ایک عنوان قائم کیا کہ "احسان لینا گوارا نہ تھا" اور اس رقعہ کی بنا پر یہ "ثابت" کر دیا کہ غالب کسی کا ذرا سا بھی احسان نہیں لیتے تھے[۱] گو یا رائے امید سنگھ صاحب سے جو پچیس جلدیں لی تھیں وہ قرضہ وصول کیا تھا۔ اور پھر یہ تو اس پر حالت ہے کہ غالب کی قصیدہ خوانی اور فتوحات کی وہ تمام تفصیلات جو ہم نے شروع کے صفحوں پر دی ہیں وہ بھی مہر صاحب کی اسی کتاب سے لی گئی ہیں۔ مہر صاحب نے اور عنوانات بھی قائم کیے ہیں مثلاً "انکسار"! یا "مخالفت سے عفوا ور درگذر"!

اصل میں "انصاف بالائے طاعت" کے اصول پر تو اب تک محض دو کتابیں لکھی گئی ہیں ایک "غالب" از ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب اور دوسری 'غالب نامہ' از شیخ محمد اکرام صاحب۔ ڈاکٹر صاحب کی کتاب کو بعض جگہ ذرا کڑی بلکہ کڑ ڈی ہو گئی ہے۔ لیکن انھوں نے اصول نقد و تبصرہ کا نہایت اچھا اسلوب پیش کیا ہے۔ شیخ صاحب کی کتاب کو اصل میں ڈاکٹر صاحب کی کتاب کا تتمہ سمجھنا چاہیے۔ شیخ صاحب نے اس خاکے میں رنگ بھرے ہیں جو ڈاکٹر صاحب نے تیار کیا تھا بلکہ خود خاکے کو بھی اکثر جگہ سے درست کر دیا ہے۔ افسوس ہے غالب نامہ

---

[۱] غالب از مہر صفحہ ۲۶۲

کی زبان ایسی نہیں، جیسی کہ کسی ادبی کتاب کی زبان کو ہونا چاہیے تھا۔
لیکن اس کے علاوہ کتاب ساری کی ساری نہایت قابل قدر ہے۔

غالب اور قتیل دشمنی

ہم اپنے مقصد سے کچھ دُور جا پڑے۔ اس فرصت میں ہمارا مطلب غالب کے سوانح حیات پر ایک عام بحث نہیں ہے۔ بلکہ اس معاملے اور جذبے کو خصوصیت کے ساتھ پرکھنا اور "انصاف بالائے طاعت" کے اصول پر کسنا ہے جس سے "ادبی خطوط غالب"[۵۱] کے صفحے کے صفحے پر ہیں۔ یعنی غالب کی قتیل دشمنی۔ مرزا غالب پر قتیل مرحوم کی مخالفت مرض کی حد تک مستولی تھی۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس افسوسناک قضیہ کا اصلیت میں بھی کوئی علمی یا ادبی مقصد یا سبب تھا یا یہ سب محض ذاتی عناد اور خدا واسطے کی دشمنی کے مظاہرے تھے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ اس سوال کا جواب حتی الامکان نیک نیتی اور انصاف سے آئندہ صفحوں میں نذر ناظرین کریں۔

غالب کا یہ معرکہ فارسی زباندانی کے متعلق تھا۔ یوں تو وہ عقل اور سمجھ، علم و ادب، ذہانت و ذکاوت، بذلہ سنجی اور ظرافت، شکل اور صورت[۵۲] حتی کہ معرفت خدا اور تفہیم اصول مذہب[۵۳] تک میں اپنے کو سب سے بہتر و افضل

---

۵۱ مرتبہ جناب مرزا محمد عسکری صاحب بی۔ اے لکھنوی۔ انوار المطابع لکھنؤ

۵۲ مرزا حاتم علی مہر کو لکھتے ہیں" تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہیں آیا کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ (باقی ص ۴۹)

سمجھتے تھے لیکن جس چیز کو وہ بلا شرکت غیرے اپنی ملکیت سمجھتے تھے اور جس کے وہ بزعم خود تنہا وارث تھے وہ فارسی زبان تھی۔ ہندوستان کے فارسی داں متقدمین ہوں یا متاخرین ان کی نظر میں انتہائی ہیچ و پوچ اور اور اس درجہ گئے گذرے تھے کہ ان کا نام لینا بھی مرزا کو گوارا نہ تھا۔

خودستائی اور غرور کا یہ عالم تھا کہ فرماتے ہیں ؎

ہرچند زمانہ مجمع جہال است   وز جہل نہ حال شاں بیک منوال است
کودن ہمہ لیک از یکے دگرے   فرق خرے عیسیٰ و خر دجال است

ان کا یہ غلو شروع ہی سے تھا[۱]۔ لیکن کوئی خاص موقعہ ایسا نہیں آیا تھا کہ ان کا یہ عقیدہ اوروں پر بھی پوری طرح ظاہر ہو۔ یا ان کو اپنی فضیلت جتانے اور منوانے کی ضرورت ہو۔ یہ صورت اسوقت پیدا ہوئی جب وہ اپنی پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں پہلی بار دلی سے نکلے اور کلکتے پہنچے اب ماحول نے غالب کو جتانا شروع کیا کہ نہ دنیا دلی اور آگرے پر ختم ہے نہ علم غالب پر۔ کلکتہ میں مرزا کو پہلی بار معترض کے نشتر کا مزا چکھنا پڑا اور یہی دجلان کے دل کی بات کو منظر عام پر لانے کا باعث ہوئی۔ اپنی فضیلت

(بقیہ صفحہ گذشتہ) اس کی ستائش کیا کرتے تھے"

۵۳ مولوی حمزہ خاں کو لکھا ہے "مولوی مشہور ہونا اور رسائل ابوحنیفہ کو دیکھنا اور مسائل حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے اور عرفا کے کلام سے حقیقت حقہ وحدت وجود کو اپنے دل نشین کرنا اور ہے .... میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں"

۱ غالب نامہ صفحہ ۲۲

اور دوسروں کی ہیچمدانی کو اچھالنے کا اس سے اچھا اور کیا موقعہ ہو سکتا تھا۔ اس وقت سے غالب نے ہندوستان کے فارسی دانوں کی علانیہ تضحیک و تذلیل میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اور چونکہ غالب پر پہلا اعتراض مرزا قتیل مرحوم کی سند پر ہوا تھا اس لئے بے چارے قتیل کی تو وہ شامت آئی کہ خدا کی پناہ۔

غالب کا پس منظر

قبل اس کے کہ جناب کو اس آتش فشانی ماحول سے آگاہ کیا جائے جو کلکتہ میں غالب پر اعتراض ہونے کے بعد بشکل سب و شتم وہاں غالب سے بہہ نکلا یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے پس منظر پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے کیونکہ میرا یہ خیال ہے کہ اگر مرزا غالب کی زندگی کی دوسری تلخیاں اور ناکامیاں ان کے دل و دماغ کو مشتعل اور ذکی الحس نہ کئے ہوئے ہوتیں تو ان کی طبیعت اس درجہ تلخ نہ ہو جاتی کہ ع کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی۔ اور نہ وہ محض ایک اعتراض پر اس قدر پھوٹ بہتے۔

غالب کی شروع کی زندگی بہت آرام و آسائش بلکہ ایک حد تک عیاشی میں گذری تھی۔ لیکن باپ اور چچا کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد حالات بہت تبدیل ہو گئے تھے۔ ان کے باپ اور چچا نواب احمد بخش کے ساتھ اس زمانے کے فوجی معرکوں میں شریک رہے تھے۔ اور غالباً نواب موصوف ہی کی کوششوں سے ان دونوں کی فوجی خدمات کے عوض انور اور کمپنی بہادر نے کچھ جاگیریں ان کے پسماندگان کے لئے دے دی تھیں غالب کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ کی شادی بھی نواب احمد بخش کی بہن سے

ہوئی تھی ۔ نواب کے اسی تعلق کی بنا پر مرزا غالب کی شادی تیرہ برس ہی کی عمر میں نواب موصوف کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش معروف کی لڑکی سے ہوئی بلکہ اتنی کم عمری میں شادی کر لینے اور ان کو خانہ داماد رکھنے کی وجہ ہی یہ تھی کہ نواب احمد بخش ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ سلوک ہونا چاہتے تھے ۔ دلی میں سسرال کی بدولت عموماً اور نواب احمد بخش اور الٰہی بخش معروف کے سلوک کی وجہ سے خصوصاً مرزا غالب کے شروع کے آٹھ دس برس بہت آرام سے گذر گئے ۔ لیکن نواب الٰہی بخش نے ۱۲۴۱ھ میں انتقال کیا اور نواب احمد بخش فیروز پور کی گدی اپنے بڑے بیٹے نواب شمس الدین احمد خاں کو سپرد کر کے الگ ہو بیٹھے ۔ پھر ۱۲۴۲ھ میں خود نواب احمد بخش کا بھی انتقال ہو گیا ۔ اس وقت سے غالب کی معاش میں واقعی بڑی کھنڈت پڑ گئی ۔ اور ان کو اس مد میں بے حد کشاکش اٹھانی پڑی ۔ گویا معاشی نقطہ نظر سے پہلی عیاشی اور بے غل و غشی کے مقابلے میں اب صرف ساڑھے باسٹھ روپیہ ماہوار کی پنشن ان کے لئے ذائقہ زندگی کے برابر تھی ۔ اور قرض خواہوں کے تقاضوں نے ان پر عرصۂ زیست تنگ کر دیا تھا ۔ نجی حالات بھی دل خوش کن نہ تھے ۔ گھر میں پے در پے سات بچے ہوئے اور سب ضائع ہو گئے ؎۱

؎۱ اس کی وجہ زیادہ تر ان کے خون کی حدت معلوم ہوتی ہے جس کی وجہ سے انکی زندگی کے آخری کئی سال بے حد تکلیف اور صعوبت میں گذرے ۔ یہ خون کی حدت و تحریک کچھ تو خاندانی تھی جس کے اثر سے ان کے بھائی تو بالکل ہی دیوانے ہو گئے اور کچھ شراب کی زیادتی سے شاید "ستم پیشہ ڈومنی" کے "عطیات" بھی اس میں شامل ہوں ۔ مسلسل سات بچوں کا رضاعت ہی میں ضائع ہونا شاید اس وجہ سے ہو ۔

ادھر بھائی دیوانہ ہو گیا۔ سماج میں جو ان کی حیثیت تھی وہ شاید ان کو سب سے زیادہ دل برداشتہ اور آشفتہ خاطر کئے ہوئے تھی۔ قلعہ میں رسوخ کی بہت تمنا تھی اور اس کے لئے جس طرح بھی بن پڑا کوششیں بھی بہت کیں۔ لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ جس چیز نے ان کو آزردہ کر رکھا تھا وہ دلی والوں کی بقول غالب ان کے کلام کی ناقدری تھی۔ وہ پندرہ سولہ برس کی عمر میں مستقلاً دلی چلے آئے تھے۔ اور پچیس برس کی عمر تک اردو میں شعر کہتے رہے۔ لیکن ان دس سال میں کبھی کوئی قدر نہ ہوئی۔ بلکہ عموماً بر سرِ مشاعرہ ان کے فارسی نما اردو کلام پر بے معنی، بے مزہ اور ناکارہ ہونے کے الزام لگائے جاتے تھے۔ اور تضحیکاً بے معنی الفاظ اور تراکیب کو جوڑ جوڑ کر گویا غالب کی طرز کی نقل کی جاتی تھی[۱]۔ اس کے برخلاف بادشاہ، قلعے کے سینکڑوں شاہزادے اور شہر کے خاص و عام ذوق کی محاورہ بندی اور روزمرہ کے بے انتہا مداح تھے۔ مرزا اس چیز سے اس قدر محزون اور کبیدہ خاطر تھے کہ صلہ اور ستائش کے انتہا سے زیادہ خواہشمند ہونے کے باوجود انتہائی یاس سے فرمایا ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

ممنون۔ ذوق اور مومن وغیرہ کی شہرت اور قدردانی کو اور کھوئے دیتی تھی۔ یوں

---

۱ ان میں عوام ہی نہیں بلکہ خواص تک شامل تھے۔ حکیم آغا جان عیش کا مشہور قطعہ "مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے" یا مولانا فضلِ حق خیرآبادی کا بھینس کے انڈے والا شعر اسی ضمن کی چیزیں ہیں۔

وہ طبعاً بھی ایسے واقع ہوئے تھے کہ دنیا کو دیکھ دیکھ کر جلے جلتے تھے۔ اور خاص و عام کے حسد کے مارے مرے جاتے تھے۔ فرماتے ہیں ؎

غالب غمِ روزگار ناکامم کشت ⁂ از تنگیٔ دل بحلقۂ دامم کشت
ہم غیرتِ سر بزرگیٔ خاصم سوخت ⁂ ہم رشکِ نشاط بندیٔ عامم کشت

پچیس برس کی عمر کے بعد سے اسی کوفت کی باعث انھوں نے اردو میں شعر کہنا ہی چھوڑ دیا۔ اور اس کے بجائے فارسی شروع کی۔ فارسی میں دلّی میں ان کو واقعی امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ گو اس وقت بھی دلّی میں مولانا فضل حق خیرآبادی۔ مفتی صدرالدین آزردہ۔ حکیم مومن خاں۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ۔ مولانا صہبائی وغیرہ اصحاب موجود تھے۔ اور گو یہ سب اہلِ علم حضرات تھے جنھوں نے تحصیلِ علوم متفرق میں عمریں صرف کی تھیں لیکن فارسی محاورہ اور فارسی زبان دانی میں یقیناً غالب کے ہم پلہ نہ تھے۔ دلّی آنے کے بعد غالب نے فارسی شعرا کا غائر مطالعہ کیا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ مرزا کے کلام کی روایات کا سلسلہ حزیں۔ بیدل۔ ظہوری۔ عرفی۔ نظیری کے واسطے سے امیر خسرو تک پہنچتا تھا۔ گو شروع انھوں نے بیدل کے رنگ سے کیا۔ لیکن "جب انھوں نے فارسی شاعری کا زیادہ مطالعہ کیا۔ اور شیخ علی حزیں نے مسکرا کر ان کی بے راہ روی ان کو جتائی اور طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا جو مادہ تھا وہ فنا کر دیا۔ اور نظیری نے اپنی خاص روش پر چلنا سکھایا تو ان کے کلام میں ان شعرا کی خصوصیات آگئیں[1]۔" مختصر یہ کہ اس وقت غالب فارسی دانی میں

---

[1] غالب نامہ صفحہ ۲۸ و ۲۹

یقیناً دلّی میں یکتا تھے ۔ اور اس کا احساس ان جیسے خود پرست آدمی کو کما حقہٗ تھا۔ وہ ہم چو من دیگرے نیست کا مجسمہ تھے ۔ اور پھر اس میں اس قدر تفاخر و تمرّد کہ مبدا فیض کے علاوہ کسی کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنا ہتک سمجھتے تھے ۔ ملا عبدالصمد (ہرمزد) کی شاگردی کو باعث عار سمجھا اور اکثر اس سے انکار کیا[۵۱] القصہ غالب کا معاشی نجی اور سماجی ماحول اس وقت نہایت ہی یاس انگیز اور تاریک تھا ۔ چاروں طرف سے مجبوریوں نے گھیر رکھا تھا ۔ ایک لے دے کر فارسی دانی رہ گئی تھی جس کو وہ اصل زندگی اور حاصلِ زندگی سمجھے ہوئے تھے ۔ ان حالات میں پنشن کے مقدمے کے لئے ان کو دلّی چھوڑنی پڑی ۔ دلّی سے کلکتہ تک سفر کے حالات بھی خلافِ طبیعت اور خلاف امید ہوتے گئے ۔ اور ان کی ناکامیوں نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا ۔ راستہ میں بڑی امیدوں اور کافِ کرم کی کششوں کے ساتھ لکھنؤ گئے ۔ یہاں نائب السلطنت معتمد الدولہ آغا میر کا زمانہ تھا ۔ مرزا قتیل کی وفات کو آٹھ نو برس ہو چکے تھے ۔ لیکن قتیل کی شہرت اور عزت اس شہر میں ایسی تھی آٹھ نو سال کیا اسّی نوّے سال کا بُعد بھی اس میں کوئی کمی پیدا نہ کرتا ۔ غالب کے متوسلین ناسخ وغیرہ بھی قتیل کے دوست اور مداح تھے[۵۲] خود معتمد الدولہ بھی قتیل مرحوم کے معتقدین میں سے تھا پھر

---

۵۱ یادگار غالب صفحہ ۱۱

۵۲ ناسخ کے تعلقات مرزا قتیل سے خاص تھے ۔ مرزا قتیل نے اس طرح اپنے رقعات میں ناسخ کا ذکر کیا ہے ۔ " لال بیگ رقعہ در حویلی نو تعمیر من کہ (باقی صفحہ ۷۴)

اس وقت کے لکھنؤ میں دلّی کی بہ نسبت فارسی کا زیادہ چرچا تھا جس کا خود غالب کو اعتراف تھا۔ اس کی وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ اودھ سلطنت کی زر ریزی اور زر پاشی کی وجہ سے اکثر ہندی اہلِ کمال وہاں چلے گئے تھے بلکہ سلطنت کے سرکاری مذہب کی وجہ سے ایرانی علما اور ادبا کا بھی وہاں "تانتا بندھا ہوا تھا۔ جو اکثر وہیں رہ جاتے تھے۔ لیکن اس شہر میں غالب کی کوئی قدر نہ ہوئی۔ بادشاہ تو بادشاہ نائب السلطنت سے بھی ملاقات نہ ہو سکی گو وہ اس امید میں بقول صاحبِ غالب نامہ گیارہ ماہ کے قریب لکھنؤ پڑے رہے۔ غالب کی حساس طبیعت اس چیز کو نظر انداز نہ کر سکتی تھی کہ جس شہر میں قتیل نے اقلیم سخن کی بادشاہی کی ہو اور جس میں اب مرنے کے بعد بھی اس کی یہ عظمت اور وقعت ہو وہاں غالب کی مطلق نہ چلے۔ اس چیز نے غالب کو غیر شعوری طور پر متاثر کیا ہوگا۔ اور گویا قتیل کی مخالفت کی بنیاد یہاں رکھی گئی ہوگی۔ لکھنؤ سے چلے تو یہاں سے کلکتہ تک وہ علاقہ تھا جہاں فارسی داں زیادہ تر قتیل کے شاگرد یا مداح تھے۔ غرضکہ ان سب خلافِ طبع باتوں نے رہا سہا ضبط اور توازن بھی کھو دیا۔ اور ان کا چڑچڑاپن اور تمتّی کر گیا۔ کریلا اور نیم چڑھا۔ چنانچہ اس طرح "از بیدادِ روزگار نالاں و سینہ بہ دم تیغ مالاں بہ کلکتہ رسیدم"[1] کلکتہ کا قیام بھی

(بقیہ صفحہ گذشتہ) برائے ورود بعضے دوستاں ہا نجا می تشنیم رسانید۔ آں وقت شیخ امام بخش ناسخ و میر سعادت علی رنیق مرزا حاجی صاحب و آقا صاحبان محمد وہم نشستہ بودند" رقعہ نمبر۱۸ اس کے علاوہ ناسخ کا تمام تر عروج مرزا حاجی کے زیر سایہ ہوا۔ اور یہ مرزا حاجی قتیل کے شاگرد تھے۔

[1] بنام مولوی محمد علی صدر امین باندہ۔ یادگار غالب صفحہ ۱۵۔

بے فائدہ اور فضول ثابت ہوا۔ کیونکہ جس مقصد سے گئے تھے اس میں قطعی ناکامی ہوئی۔ حکام بالا دست کا فیصلہ ہوا کہ یہاں کوشش کرنی بیکار ہے دلی کے ریذیڈنٹ کے ذریعہ اور واسطے سے یہ مقدمہ یہاں آنا چاہئے۔ غرضکہ ان سب چیزوں نے مل کر غالب کو غیر معمولی طور پر ذکی الحس بنادیا تھا اب لے دے کر ان کی وہی فارسی دانی رہ گئی تھی جس پر ان کا ایمان تھا۔ لیکن قسمت کو کچھ یہ منظور تھا کہ اس میں بھی شکوک پیدا ہو جائیں۔

غالب پر اعتراض

"کلکتہ میں ان دنوں مدرسہ کلکتہ کے زیر اہتمام ہر ماہ ایک بزم مشاعرہ منعقد ہوا کرتی تھی۔ جب مرزا وہاں پہنچے تو ان کے اعزاز میں ایک خاص مشاعرہ ہوا۔ پانچ ہزار کا مجمع تھا اس میں غالب نے اپنی وہ غزل پڑھی جس کا یہ مقطع بہت مشہور ہے ؎

گر دہم شرح ستم ہائے عزیزاں غالب ؎ رسم امید ہمانا ز جہاں برخیزد

جب اس شعر پر پہنچے ؎

جزوے از عالم و از ہمہ عالم بیشم ؎ ہمچو موئے کہ بتاں را ز میاں برخیزد

تو حاضرین میں سے کسی نے اعتراض کیا کہ ہمہ عالم کی ترکیب غلط ہے۔ عالم مفرد ہے اس کا ربط ہمہ کے ساتھ بہ حسب اجتہادِ قتیل ممنوع ہے[1]۔" اسی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ذیل کے شعر پر بھی اعتراض ہوا کہ زدہ کا استعمال غلط ہے ؎

شور اشکے بفشارِ بن مژگاں دارم ؎ طعنہ بر بے سر و سامانی طوفاں زدہ

غالب کے معترضین میں مولوی عبدالقادر رام پوری، مولوی کرم حسین بلگرامی،

---

[1] ذکرِ غالب صفحہ ۳۲

مولوی نعمت علی عظیم آبادی اور دوسرے فارسی کے مستند استاد تھے[51] ادھر غالب بھی اکیلے نہیں تھے نواب اکبر علی خاں اور مولوی محمد محسن نے غالب کی طرف سے جواب دئے ۔ غالب نے اس قصہ کو اس طرح بیان کیا ہے :-

" ازلوا در حالات این کہ سخن وران و نکتہ رسان این بقعہ پس از ورودِ خاکسار بزم سخنے آراستہ بودند ۔ در ہر ماہ شمسی انگریزی روز یکشنبہ نخستین سخن گویان در مدرسہ سرکاری کمپنی فراہم شدندے و غزل ہائے ہندی و فارسی خواندندے ۔ ناگاہ گرانمایہ مردے کہ از ہرات بہ سفارت رسیدہ است دران انجمن می رسد و اشعار مرا شنودہ بہ بانگ بلندی می ستائد ۔ در کلامِ نادرہ گویانِ این قلمرو تبسم ہائے زیر لبی ی فرماید چوں طبائع بالذات مفترنِ خود نمائی است ہمگنان حسدی برند ۔ وکلانانِ انجمن و فرزانگانِ فن بر دو بیت من اعتراض نادرست برآوردہ آں را شہرت می دہند[52] "

مختصر یہ کہ یہ پہلا موقعہ تھا کہ مرزا غالب نے مرزا قتیل کی سند (جو حقیقتاً غلط بیانی تھی، تفصیل آگے ملاحظہ فرمائیے) پر معترض کی نشتر زنی کا مزا چکھا ۔ معترضین پر تو خیر بگڑے ہی لیکن ساتھ ہی مرزا قتیل سے بھی باپ مارے کا بیر ہو گیا ۔ اگر مرزا متانت سے اس اعتراض پر غور فرماتے تو بآسانی یہ ثابت کر دیتے کہ یہ سند اتہام سے زیادہ نہ تھی ۔ قتیل بےچارے نے نہ

---

۵۱ غالب نامہ صفحہ ۴۱

۵۲ خط بنام مولوی محمد علی خاں صدامین باندہ

کہیں ایسا کہا نہ اپنی متعدد کتابوں میں کہیں ایسا لکھا۔ بلکہ یہ سب معترضین کے افترا پرداز طبائع اور زرخیز دماغ کی کارفرمائیاں تھیں۔ قتیل کے سر اس لئے منڈھ دیا گیا تھا کہ سند میں وزن اور ثقاہت پیدا ہو جائے۔ لیکن مرزا غالب کو یہ کہاں تاب تھی مان کے یہ دماغ تھے کہ فیضی تک کی بھی کچھ اصلیت نہ سمجھتے تھے۔ مرزا قتیل کی (مفروضہ) سند پر ناک بھوں چڑھائی اور طعن و تشنیع پر اتر آئے۔ بولے دیوالی سنگھ فرید آباد کے کھتری کے قول کو میں نہیں مانتا۔ اس پر بجا طور پر حاضرین میں جوش و خروش پیدا ہوا اور مرزا پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ جس پر تنگ آکر انھوں نے مشہور مثنوی موسوم بہ "بادِ مخالف" لکھی۔ بے محل نہ ہوگا اگر یہاں اس کے کچھ حصے نقل کئے جائیں:-

اے تماشائیانِ بزمِ سخن	وے مسیحا دمانِ نادرہ فن
اے سخن پرورانِ کلکتہ	وے زبان آورانِ کلکتہ
اے بشغلِ وکالت آمادہ	دادِ غم خواریِ جہاں دادہ
اے عزیزانِ ایں سوادِ عظیم	وے فراہم شدہ ز ہفت اقلیم
ہمچو من آرمیدۂ ایں شہر	بہر کارے رسیدۂ ایں شہر
اسد اللہ بخت برگشتہ	در خم و پیچ عجز سرگشتہ
گرچہ ناخواندہ مہمان شماست	بے سخن ریزہ چین خوان شماست
بہ تظلم رسیدہ است ایں جا	بامید آرمیدہ است ایں جا
کارِ احباب ساختن رسم است	میہماں را نواختن رسم است
آں رہ و رسم کارسازی کو	شیوۂ مہماں نوازی کو
چہ بلاہا کشیدہ ام آخر	کہ باینجا رسیدہ ام آخر

نہ ہمیں نالہ و فغاں بلبم ⁂ من و جان آفریں کہ جاں بلبم
مو بہ چوں موئے کردہ است مرا ⁂ غصہ بد خوئے کردہ است مرا

پھر کہتے ہیں کہ مخالفت کا آغاز میری طرف سے نہیں ہوا اور جب اعتراضات کا جواب مل گیا تو پھر کیا وجہ کہ آپ لوگ میری تائید نہیں کرتے۔ آپ کی اس بات پر میری گفتگو کا انداز تلخ ہو گیا۔ لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ قدر دان اصحاب اس پر ناراض ہو گئے ہیں تو مجھے بڑی پشیمانی لاحق ہوئی۔ کاش میں چپ رہتا۔ پھر کہتے ہیں ؎

بندہ ام بندہ مہربانان را ⁂ رمز فہما و نکتہ دانان را
نہ تو آوریزشش بیان ترسم ⁂ من و ایان من کزاں ترسم
کہ پس از من بہ سال ہائے دراز ⁂ بہ زبان ماند ایں حکایت باز
کہ سفیہے رسیدہ بود ایں جا ⁂ چند روز آرمیدہ بود ایں جا
با بزرگاں ستیزہ پیش گرفت ⁂ زحمتے داد و راہ خویش گرفت
شوخ چشمے و زشت خوئے بود ⁂ بے حیائے و ہرزہ گوئے بود
برگ و دنبالہ سازِ دنیش بود ⁂ ننگِ دہلی و سرزمینش بود
آہ ازاں دم کہ بعد رفتنِ من ⁂ خونِ دہلی بود بہ گردنِ من

پھر کہتے ہیں کہ نہ میں نے قتیل کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ نہ اس کی شہرت پر رشک ہے۔ نہ میں اسے بُرا کہتا ہوں۔ دوستوں کو مجھ سے شکوہ ہے کہ میں قتیل کی پیروی کیوں نہیں کرتا ؎

دامن از کف کنم چگونہ رہا ⁂ طالب و عرفی و نظیری را
خاصہ روح روانِ معنی را ⁂ آں ظہوری جہانِ معنی را

آں کسے کردہ ایں مواقف را ؎ چہ شناسد قتیل و واقف را

آخر میں قتیل کی مدح لکھی ہے جو حقیقتاً ہجو ملیح ہے ؎

می شوم خویش را بہ صلح دلیل ؎ می سرایم نوائے مدح قتیل

تا نہ ماند ز من دگر گلۂ ؎ رسد از مہروانِ وے صلۂ

گرچہ ایرانیش نہ خواہم گفت ؎ سعدی ثانیش نہ خواہم گفت

لیک از من ہزار بار بہ است ؎ از من و ہمچو من ہزار بہ است

من کفِ خاک و او سپہر بلند ؎ خاک را کے رسد بچرخ بلند

وصفِ او حد چوں منے نہ بود ؎ بہر در خورد در وزنے نہ بود

مرحبا ساز خوش بیانئے او ؎ حبذا شور نکتہ دانئے او

نظمش آبِ حیات را ماند ؎ در روانی فرات را ماند

نثر او نقش بال طاؤس است ؎ انتخابِ صراح و قاموس است

بادشاہے کہ در قلمرو حرف ؎ کردہ ایجاد نکتہ ہائے شگرف

خام ہندوئے پارسی دانش ؎ ہندیاں سر بخطِ فرمانش

ایں رقم ہا کہ ریخت کلکِ خیال ؎ بود سطرے ز نامۂ اعمال

از منِ نارسائے ہیچ دان ؎ معذرت نامہ ایست نزدِ یاراں

بو کہ آید ز عذر خواہی ما ؎ رحم بر ما و بے گناہی ما

آشتی نامہ و وداد پیام ؎ ختم شد والسلام والاکرام

لیکن جیسا کہ ظاہر ہے اس معذرت میں بھی تعریضات کے اس قدر تیز نشتر تھے کہ اس سے سکون ہونا تو درکنار مخالفت اور بڑھ گئی۔ غالب یہ چرکا بھولنے والے نہ تھے۔ جا اور بے جا۔ موقعہ سے اور بے موقعہ

جہاں اور جب ان کا ڈھب پڑا انھوں نے مرزا قتیل کو گالیاں دینے میں کسر نہ اٹھا رکھی۔ اس جگہ یہ انتہائی افسوس کے ساتھ ماننا پڑیگا کہ غالب نے اس دریدہ دہنی اور رکیک پنے سے مرزا قتیل پر حملے کئے کہ خود مرزا غالب کی طرف سے طبیعت کو تنفر ہونے لگتا ہے۔ مرزا قتیل کے انتقال کو ایک مدت ہوگئی تھی اور معمولی تہذیب اور تمیز کا تقاضا تھا کہ ان پر ایسے حملے نہ کئے جائیں جن کا تعلق ذات سے ہو۔ علم وادب سے دور کا واسطہ بھی نہ ہو۔ لیکن جلے ہوؤں کے پتھر مارنے کی مثل مرزا غالب پر پوری اتری۔ یہ صحیح ہے کہ مرزا قتیل نومسلم تھے۔ لیکن مسلمان ہونے کے بعد وہ نہایت نیک مسلمان ثابت ہوئے۔ ان کا اخلاق ان کی علمیت ان کی خدا دوستی اور ان کی خدا ترسی زبان زد خلائق تھی ان کی ذات دنیاوی، دینی اور علمی غرضکہ ہر نقطہ نظر سے دراصل منبع فیض تھی۔ اس کے خلاف خود غالب کس قدر شرع کے پابند تھے؟ اس کے بتانے کی نہ یہاں ضرورت نہ جگہ۔ لیکن اس کے باوجود مرزا قتیل کو انھوں نے ہمیشہ دیوالی سنگھ، ہندو بچہ کھتری بچہ لقب سے یاد کیا۔ چودھری عبدالغفور سرور نے اپنے ایک رقعہ میں مرزا قتیل کو "مرحوم" لکھا غالب اس سے جبراغ پا ہوگئے۔ جواب میں اس پر طنز کی اور خود اصلاح دے کر "لالہ دیوالی سنگھ قتیل" متوفی [۵۱] لکھا۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں "اصل فارسی کو اس کھتری بچے قتیل علیہ ما علیہ نے تباہ کیا"[۵۲]

---

[۵۱] ادبی خطوط غالب صفحہ ۶۸

[۵۲] " " " " ۶۸

ایک اور جگہ قتیل کی عداوت میں کہتے ہیں " مشرک وہ ہیں جو نسلوں کو ابو الائمہ کا ہمسر مانتے ہیں[۵۱]" ایک جگہ لکھا ہے " چار شربت[۵۲] اور غیاث اللغات کو حیض کا لتہ[۵۳] سمجھتا ہوں۔ ایسے گمنام چھوکروں سے کیا مقابلہ کروں گا[۵۴]" ایک اور جگہ گل افشانی فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں۔" وہ گھگس ابو عبدالواسع انسوی .... اور وہ اُلّو کا پٹھا قتیل[۵۵]" اصل یہ ہے کہ یہ جلے پھپھولے اس لئے اور بھی پھوڑے جاتے تھے کہ یوں حقیقت میں تو قتیل کی کوئی قابل گرفت غلطی پا نہ سکے گالیاں دے دے کر اور منہ چڑا چڑا کر اپنا دل ٹھنڈا کرنا پڑا۔ کلکتہ کے واقعہ کے بعد سے قتیل کی دشمنی انکی رگ رگ میں پیوست ہو گئی تھی۔ ادھر قتیل کی مقبولیت اور ان کو خشمگیں سے کئے دیتی تھی۔ چودھری عبدالغفور کو لکھتے ہیں

---

۵۱ یادگار غالب صفحہ ۱۳۷

۵۲ چار شربت قتیل کی مشہور کتاب ہے۔

۵۳ غالب کو اس موضوع سے خاص دلچسپی تھی۔ ایک جگہ نواب علاؤالدین کے نام کے خط میں مولوی حمزہ خاں کو لکھتے ہیں۔" رسائل ابو حنیفہ کو دیکھنا اور مسائل حیض و نفاس میں غوطے لگانا ہے اور عرفا کے کلام سے حقیقت حقہ وحدت وجود کو اپنے دل نشیں کرنا اور"۔ ایک جگہ اور نواب شہاب الدین کے نام کے خط میں کسی قاضی کے متعلق ارشاد ہوتا ہے" میاں وہ قاضی تو چوتیا مسخرہ ہے " (غالب کی شوخیاں صفحہ ۶۴) یوسف مرزا کے نام خط میں لکھتے ہیں " ترحم سبب ہے تو تغافل کیا ہوگا۔ میں خود موجود ہوں اور حکام صدر کا روشناس پشم نہیں اکھیڑ سکتا " (غالب کی شوخیاں صفحہ ۶۴)

۵۴ ادبی خطوط غالب صفحہ ۱۶۴

"قتیل لکھنوی اور غیاث الدین ملائے مکتبی رامپوری کی قسمت کہاں سے لاؤں کہ تم جیسا شخص میرا معتقد ہو اور میرے قول کو معتمد سمجھے۔"

مرزا غالب کے حالات ایسے ہوتے رہے کہ غدر سے پہلے انکو اتنا اطمینان نہ مل سکا کہ وہ قتیل وغیرہ سے پورا پورا انتقام لے سکیں

مرزا غالب کا قیام کلکتہ قطعی بے سود ثابت ہوا۔ دو سال گذر گئے اور جس منزل کو پیش نظر رکھ کر نکلے تھے وہاں تک رسائی نہیں ہوئی تو مرزا کی طبیعت پر مایوسی غالب آگئی۔ اور نہایت یاس کے عالم میں واپس دلی پہنچے۔ ناکامیاں کسی طرح پیچھا نہ چھوڑتی تھیں اور ان کی وجہ سے ان کی مزاج کی تلخی بڑھتی جاتی تھی قتیل کی مخالفت بھی شدت پکڑتی جاتی تھی لیکن حالات کی ناساعدت سب پر حاوی تھی اور اسی وجہ سے مرزا ابھی تک قتیل وغیرہ کے خلاف جی بھر کے غبار نہ نکال سکے تھے، گو یہ کھٹک جان کے ساتھ لگی رہی۔ حسب ذیل تفصیلات سے یہ واضح ہوگا کہ کلکتے سے واپسی کے بعد سے غدر تک وہ قتیل کی طرف کیوں متوجہ نہ ہو سکے:۔

۱۱ نومبر ۱۸۲۹ء کو وہ دلی واپس پہنچے تھے۔ اس وقت سے اور ۲۷ جنوری ۱۸۳۱ء تک پنشن کے سلسلے میں وہ انتہائی مشغول رہے۔ ۲۷ جنوری ۱۸۳۱ء کو پنشن کا فیصلہ غالب کے خلاف سنایا گیا۔ اور گویا ان کی ساری امیدوں پر اوس پڑگئی۔" مرزا کو ایک تو اتنی کوشش رائیگاں جانے کا افسوس تھا دوسرے اہلیان دہلی کے طعنے۔ جن سے بچنے کے لئے معلوم ہوتا ہے انھیں شروع شروع میں کنج عزلت میں پناہ لینی پڑی۔ ابتدا میں تو مایوسی اور رنج کی شدت سے طبیعت فکر شعر کے ناقابل تھی لیکن آہستہ آہستہ اس

زخم کا اندمال ہونا شروع ہوا[۹۱]۔ اس کے بعد مسٹر ولیم فریزر دلّی کے ریذیڈنٹ ہو کر آئے اور ان سے غالب کے تعلقات بہت استوار ہو گئے۔ غالب نے اس دوستی سے فائدہ اُٹھانا چاہا اور پھر اپنی پنشن کا معاملہ اُٹھایا۔ مسٹر ولیم فریزر نے کچھ امیدیں بھی دلائیں۔ وہ نواب شمس الدین خاں کے خلاف پہلے ہی سے تھے۔ غالب کو اس تعلق سے بڑی توقعات تھیں لیکن ۲۲ر مارچ ۱۸۳۵ء کو ولیم فریزر قتل کر دیئے گئے اس واقعے سے صرف یہی نہیں کہ غالب کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ بلکہ جب نواب شمس الدین بھی اس جرم میں ماخوذ ہوئے تو لوگوں نے کھلم کھلا کہنا شروع کیا کہ یہ چغلی غالب نے کھائی ہے نواب موصوف کو ۸ر اکتوبر ۱۸۳۵ء کو پھانسی دی گئی لیکن اس کے بہت عرصے بعد تک غالب کے خلاف اس اخلاقی کمزوری پر لے دے ہوتی رہی۔ اسی زمانہ میں دو ساہوکاروں کی ڈگریاں بھی ان کے خلاف تھیں اور وہ قید کے ڈر کے مارے خانہ نشین ہو گئے تھے صرف رات کو باہر نکلا کرتے تھے۔ اس کے بعد فارسی دیوان کی ترتیب میں مشغول رہے اور میخانۂ آرزو ۱۸۳۶ء میں ختم ہوا۔ پھر اردو دیوان کی باری آئی اور وہ پہلی بار ۱۸۴۱-۴۲ء میں طبع ہوا۔ ۱۸۴۷ء میں جوئے کے الزام میں تین ماہ کی قید بھگتنی پڑی۔ ۴ر جون ۱۸۵۰ء کو شاہ نصیر الدین عرف کالے صاحب کے توسل سے دربار سے باقاعدہ[۹۲] تعلق ہو جانے میں کامیابی ہوئی اور مہر نیمروز لکھنے پر مقرر ہوئے۔ اور ولی عہد کی استادی بھی حاصل ہوئی۔ ۱۸۵۴ء میں ذوق چل بسے اور غالب کو

---

۹۱ غالب نامہ صفحہ ۴۶

بادشاہ سلامت کی استادی بھی میسر آئی ۔ اسی سال رام پور سے بھی تعلق استوار ہوا ۔ یہ مصروفیت غدر تک رہی ۔ پھر اس تمام تیس برس کے عرصے میں پنشن کا مسئلہ اور سب مصروفیتوں اور تفکرات پر مستزاد تھا جس کے لئے وہ ہر لمحہ و ہر لحظہ کوشش کرتے رہتے تھے ۔" بہر حال غالب ۱۸۲۶ء سے لے کر ۱۸۴۲ء تک اس قضیہ میں الجھے رہے ۔ اور اس ضمن میں نئی پنشن نئے خطاب اور نئے اعزاز کی توقع پیدا ہوئی جو ۱۸۵۷ء تک خدا جانے کشاکش و فراغت بال کے کیسے کیسے خیالی منظر ان کے سامنے پیش کرتی رہی[95] " یہ تھیں وہ وجوہات کہ مرزا غالب اپنے دل کے پھپھولے نہ پھوڑ سکے ۔ اب جو غدر ہوا تو ساری دنیا پلٹ گئی ۔ نہ دربار رہا نہ درباداری نہ تعلقات نہ آنا جانا ۔ شہر کمپ ہو گیا ۔ غالب اپنا دروازہ بند کر کے بیٹھ رہے ۔ نہ یار نہ دوست صبح سے شام اور شام سے صبح تنہائی میں کٹنے لگی ۔ اب فرصت ہی فرصت تھی ۔ ادھر ہندوستانی بادشاہت کی بساط الٹ چکی تھی ۔ انگریز کی حکومت میں اب کوئی شبہ نہیں رہا تھا ۔ سوچا اس انقلاب کے متعلق کچھ ایسا لکھوں کہ آئندہ چل کر اس کی وجہ سے اپنی بریت ثابت ہو بلکہ صاحبان انگریز سے رشتۂ یکجہتی استوار ہو تاکہ مددگاری اور وفاداری کے انعامات سے بہرہ ور ہو سکوں ۔ فارسی دانی اور ایرانی الاصل ہونے کا دعویٰ برسوں سے کر ہی رہے تھے عربی یوں بھی کم جانتے تھے ۔ ارادہ کیا کہ اس طرح کی کتاب ہو کہ سوائے

---

[95] غالب از مہر صفحہ ۱۲۳

فارسی اور کسی زبان کا لغت نہ آئے۔ یہ ارادہ کرنے کو تو کر لیا۔ لیکن اس کے لئے ان کا وجدانی ذوق کافی نہ ہوا۔ اور ہندی فارسی دانوں کی لغت کے بغیر کام نہ چلا۔ اس وقت ان کے پاس دساتیر اور برہان قاطع[سلہ] ان دو کتابوں کے علاوہ اور کوئی کتاب نہ تھی۔ انہی دو کتابوں کی مدد سے دستنبو لکھی گئی۔ یوں بھی فارسی کی لغت کسی ایرانی نے لکھی ہی نہ تھی اور ہندیوں کی لکھی ہوئی لغت کے علاوہ کچھ اور ملنے کا امکان نہ تھا۔ ان کے جذبۂ ایران پرستی کو اس سے بھی ٹھیس لگی ہوگی کہ یہ لغت نویسی کا کام بھی انہی فرومایہ ہندیوں کا مرہونِ منت تھا۔ خیر ایک طرف اور اسلئے اس کے خلاف ہو گئے۔ ادھر مرزا قتیل کی مخالفت تو ہر وقت تازہ ہی تھی قتیل نے بھی اپنی کتابوں خصوصاً رقعات میں صراح قاموس وغیرہ کے ساتھ برہان قاطع کا بھی کئی جگہ ذکر کیا ہے۔ غرضیکہ ان سب وجوہات کی بنا پر غالب نے برہان قاطع کو بہت ہی معاندانہ نظر سے دیکھا۔ نقص نکالنا کچھ بہت مشکل نہیں۔ پھر برہان میں تو ترتیب وغیرہ کی وجہ سے نقص نکالنے کی گنجائش بھی خاصی تھی بس غالب نے قتیل اور دیگر ہندی فارسی دانوں کا سارا غصہ صاحبِ برہان پر اتارا۔ پھر اس کی یہ بھی وجہ تھی کہ باوجود کوشش کے وہ قتیل کی تحریرات میں کوئی واقعی گرفت نہ کر سکے۔ بہرحال مرزا غالب نے برہان پر

سلہ یہ مولوی محمد حسین تبریزی دکنی کی لکھی ہوئی لغتِ فارسی کی مشہور کتاب ہے۔ برہان قاطع کا وہ نسخہ جو ایام غدر میں مرزا کے مطالعہ میں تھا اور جس کے حاشیہ پر انھوں نے اپنے اعتراضات لکھے تھے اب ریاست لوہارو کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

جا و بے جا اعتراضات کا طومار باندھ دیا۔

برہانِ قاطع کا ہنگامہ قتیل دشمنی کا شاخسانہ تھا

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ برہانِ قاطع کا ہنگامہ اصل میں قتیل دشمنی کا شاخسانہ تھا۔ مہر صاحب فرماتے ہیں :۔

" وہ (غالب) شروع ہی سے قتیل، واقف اور اسی قماش کے دوسرے شعرا کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ لیکن کلکتہ میں اس رائے کے اظہار پر جو معرکہ تعریفات گرم ہوا اس نے غالب کے جذبۂ مخالفت میں بہت تندی تیزی اور تلخی پیدا کر دی۔ یہی جذبۂ مخالفت انجام کار قاطع برہان کی شکل میں ظاہر ہوا[1]" خود غالب نے بھی مفتی میر عباس کو خط میں لکھا ہے کہ " قاطع برہان کا لکھنا گویا باسی کڑھی میں ابال آیا[2]" غدر کے فوراً ہی بعد تو غالب اپنی بریت اور انگریز کی خوشامد میں مشغول رہے ۱۸۵۸ء میں معاش کی طرف سے انتہائی پریشانی رہی کیوں کہ وہ ساڑھے باسٹھ روپیہ والی پنشن بھی بند تھی۔ کہیں اوائل ۱۸۵۹ء میں برہانِ قاطع کے اعتراضات کو مرتب کر سکے جو ۱۸۶۲ء "قاطع برہان" کے نام سے شائع کئے گئے۔ اس میں بھی مرزا نے حسب دستور اس قدر قابلِ اعتراض طریقہ تحریر روا رکھا کہ ملک میں بجا طور برہان کے خلاف سخت جذبہ پیدا ہو گیا۔ خواجہ حالی مرحوم نے اس کی توجیہ فرمائی ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ محض غدر

---

[1] غالب از مہر صفحہ ۹،

[2] ادبی خطوط غالب صفحہ ۱۴۳

تنگ ہے۔ شیخ محمد اکرام صاحب کا فیصلہ اس ہنگامے کے متعلق سنئے:۔ بدقسمتی سے بحث نے بہت تلخ پہلو اختیار کر لیا تھا۔ اور اس کی وجہ مرزا کی طرزِ تحریر تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر مرزا اس علمی بحث میں ذاتیات کو نہ لے آتے تو مخالفین بھی اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دیتے۔ علاوہ ازیں اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جائے کہ پرانے تعلیم یافتہ اپنی شہرت کے لئے مشہور آدمیوں کی مخالفت کرتے ہیں، تب بھی نا ملائم الفاظ کے استعمال میں جو عیب ہے وہ کم نہیں ہو جاتا۔ حقیقت یہ ہے اور مرزا کے سوانح نگار کو اس امر کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ مباحثہ کے وقت وہ اپنے ترکش کے سارے تیر استعمال کرتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مصنف سے اختلاف کیا تو دلائل و براہین پر اکتفا نہ کی بلکہ اپنے قلم سے تیر و نشتر کا کام بھی لیا۔[1]"

اس معرکہ میں حسب ذیل کتابیں موافق و مخالف محاذ سے شائع ہوئیں:۔

(۱) برہانِ قاطع پر مرزا غالب نے جو اعتراضات کئے تھے وہ انھوں نے قاطع برہان (فارسی) کے نام سے طبع کرائے۔ پھر اسی قاطع برہان کا دوسرا اڈیشن درفش کاویانی کے نام سے چھپوایا۔

(۲) مرزا غالب کی ان کتابوں کے جواب میں حسب ذیل کتابیں شائع ہوئیں:۔

ل ۔ محرقِ قاطع برہان (فارسی) از مولوی سید سعادت علی

---

[1] غالب نامہ صفحہ ۹۴، ۹۵

ب ساطع برہان (فارسی) از مرزا رحیم بیگ صاحب میرٹھی

ج قاطع القاطع (فارسی) از امین الدین امین پٹیالہ

د موید البرہان (فارسی) از مولوی آغا احمد علی اصفہانی

(۳) ان مخالف کتابوں کے یہ جوابات دیئے گئے :-

ل محرق قاطع برہان کے جواب میں

(ا) دافع ہذیان (فارسی) از مولوی نجف علی

(ii) لطائف غیبی (اُردو) مصنفہ غالب بنام میاں داد خاں سیاح

(iii) سوالات عبدالکریم (اُردو) " " " عبدالکریم

ب ساطع برہان کا جواب

(ا) نامہ غالب (اُردو) از مرزا غالب

د موید البرہان کے جواب :-

(ا) قطعہ فارسی از غالب

(ii) تیغ تیز (اُردو) "

(۴) مرزا غالب کے فارسی قطعہ کا جواب مولوی عبدالصمد فدا[۵] نے فارسی قطعہ ہی میں دیا۔

---

۵ ان ساری تصانیف کا بیان جناب مالک رام صاحب کی کتاب ذکر غالب سے لیا گیا ہے۔ میں نے خود نہ ہنگامہ دل آشوب دیکھا نہ مولوی عبدالصمد فدا کا قطعہ۔ مالک رام نے جو فدا کا نام اور وطن (سلہٹ) لکھا ہے وہ سمجھ میں نہیں آتا۔ مولوی عبدالغفور نساخ بنگالی کا تذکرہ سخن شعراء عام طور پر بہت مفصل ہونے کے علاوہ بنگالے کے سارے (باقی صفحہ ۷۰ پر)

(۵) مولوی عبدالصمد فداؔ کے قطعہ کا جواب:-

ا قطعہ فارسی از سید محمد باقر علی باقرؔ

ب " " " سید فخرالدین حسین سخنؔ

نوٹ:- یہ چاروں فارسی کے قطعے (مرزا غالبؔ، فداؔ، باقرؔ اور سخنؔ کے)
"ہنگامہ دل آشوب" کے نام سے اکٹھے چھاپے گئے

چھوٹے بڑے شاعروں کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔ اس میں میر عبدالصمد فدا کو بنگال کا باشندہ نہیں لکھا۔ بلکہ ان کے متعلق حسب ذیل عبارت ہے:-

"فداؔ تخلص۔ میر عبدالصمد دہلوی۔ فرید آباد میں معلمی کرتے تھے۔ صاحب دیوان گذرے فارسی بھی کہتے تھے۔ نمونہ کلام:-

جو درد دل کا لکھوں یار کو میں لے کاغذ * تو اشک یاں تلک امڈے کہ بہہ چلے کاغذ"

نساخ مرحوم ایک اور فداؔ کا ذکر کرتے ہیں۔ جو بنگال میں جا رہے تھے۔ وہ سنئے:-

"فداؔ تخلص۔ امام الدین فرید آبادی۔ شاگرد مرتضےٰ قلی خاں فراقؔ۔ علی وردی خاں کے عہد میں بنگالے میں آکر سکونت اختیار کی۔ نمونہ کلام:-

اب جائیں کہاں تری گلی سے * جوں نقش قدم یہیں رہے ہم

تو بات بات میں ہوتا ہے مجھ سے آزردہ * یہی تو کچھ نہیں اے دل ربا تری باتیں

میں ہوں قربان اسکے کہنے کے * تو نہ بولا کر اے فدا ہم سے"

میں نہیں کہہ سکتا کہ مرزا غالب کے جواب میں جو فارسی قطعہ لکھا وہ مولوی عبدالصمد فداؔ دہلوی کا ہے یا امام الدین فداؔ فرید آبادی ساکن بنگال کا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی تیسرے صاحب مولوی عبدالصمد فداؔ سلہٹی بھی ہوں جنکا یہ قطعہ ہے۔ اور جو شاید فارسی کے علاوہ اردو مطلق نہ کہتے ہوں اسی لئے ن۔ خ نے ان کا ذکر نہیں کیا۔

(۶) باقر و سخن کے قطعات کے جواب میں :-

ا قطعہ فارسی از مولوی عبدالصمد فدا (دوم)

نوٹ :- یہ قطعہ مع گذشتہ چار قطعوں کے یکجا بنام "تیغ تیز تر" شائع کئے گئے۔

ب قطعہ فارسی از منشی جواہر سنگھ جوہر لکھنوی شاگرد ناطق مکرانی۔

(۷) قطعہ فارسی فدا (دوم) اور قطعہ فارسی جوہر کے جواب میں :-

ا قطعہ فارسی باقر (دوم)

ب " " سخن (دوم)

(۸) ایرادات بر اشعار مرزا غالب (اردو نثر) از میر آغا علی شمس[1] لکھنوی

(۹) ایرادات شمس کے جواب میں :-

ا در نثر فارسی از باقر

ب در نثر اردو از سخن

ج قطعہ اردو از محمد امیر امیر لکھنوی

نوٹ :- قطعہ فارسی فدا (دوم) قطعہ فارسی جوہر، قطعہ فارسی باقر (دوم)

---

[1] میر آغا علی شمس لکھنوی ۔ قاضی محمد صادق خاں اختر (شاگرد قتیل) کے شاگرد تھے، نمونہ کلام :-

یہ تو فرمائیے کب آئیے گا ٭ لو خوشی آپ کی رخصت ہی سہی

نہ کرو بات ادھر دیکھ تو لو ٭ نہیں الفت تو مروت ہی سہی

کٹی شب یار کی آرائشوں میں ٭ سحر تک زلف گر بلا کی بنا کی

متاع حسن ہاتھوں ہاتھ لوٹی ٭ بندھی مٹھی کھلی قسمت حنا کی

قطعہ فارسی سخن (دوم) ایرادات شمس نثر اردو، مضامین باقر فارسی، مضامین سخن اردو و قطعہ اردو آمیز یہ سب یکجائی بنام "ہنگامہ دل آشوب حصہ دوم" طبع ہوئے۔

(۱۰) تیغ تیز (غالب) کے جواب میں منشی احمد علی اصفہانی نے "شمشیر تیز تر" لکھی شمشیر تیز تر اس معرکے کی آخری کتاب تھی جو ۱۸۶۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد کسی جانب سے کوئی کتاب نہیں چھپی۔

اس ہنگامہ کو صحیح طور پر پرکھنا اور جانچنا کہ غالب کے اعتراضات کہاں تک درست تھے یا جو جوابات دئے گئے وہ کس درجے کے تھے ایک الگ فرصت چاہتا ہے۔ یہ تفصیلات یہاں یقیناً بے محل بھی ہونگی لیکن یہ صاف ظاہر ہے کہ غالب کی قاطع برہان نے ملک بھر میں آگ سی لگادی۔ ظاہراً یہ قتیل سے بے تعلق سی چیز تھی۔ لیکن اس کے جواب میں جو رسالے مختلف اصحاب کے نام سے مختلف صوبہ جات سے نکلے ان سب میں مرزا قتیل کو بہت سراہا تھا خصوصاً صاحب موید البرہان نے قتیل کی بہت تعریف کی تھی۔ ادھر سے مخالفین کا جواب خود مرزا ہی لکھتے تھے گو مصلحتاً اپنے شاگردوں کے نام سے شائع کراتے رہتے تھے۔ لطائف غیبی سیاح کے نام سے۔ محرق کا جواب قدر بلگرامی کے نام سے، موید کا جواب ذکا کی طرف سے لکھا یا لکھنا چاہا۔ مرزا تفتہ کو اسی سلسلے میں لکھتے ہیں " وہ شخص ایسا کہاں کا فارسی داں ہے کہ میں لڑکوں کی طرح بیت بحثی کروں۔ دو جوتیاں آپ لگادیں ایک جوتی تم سے لگوادی۔" لیکن سنجیدہ اور ثقہ لوگ مثلاً خواجہ غلام غوث بے خبر جو گو غالب کے کمالِ شاعری کے معترف تھے پر اس قاطع برہان والی بحث میں

مرزا سے متفق نہیں تھے[۹۱] مگر لحاظ اور دوستی کی بنا پر ان کے خلاف بھی کچھ نہ لکھتے تھے ۔ خواجہ غلام غوث بے خبر سے غالب کی دوستی کا معاملہ بھی خاصہ دلچسپ ہے ۔ مرزا غالب کی قتیل دشمنی کی انتہا یہ تھی کہ جس کا تھوڑا بہت بھی مرزا قتیل سے تعلق سن پاتے تھے اس کے بھی دشمن ہو جاتے تھے چنانچہ مولوی غلام امام شہید[۹۲] (شاگرد قتیل) وغیرہ سے یہی بیر تھا ۔ خواجہ غلام غوث بیخبر غالباً مولوی شہید کے شاگرد تھے یا کم از کم ان کے بے حد مداح ضرور تھے ۔ عام حالات میں غالب کی مخالفت کے لئے اتنا تعلق کافی تھا ۔ لیکن یہاں الٹے مرزا دوستی کرنے کی فکر میں تھے ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خواجہ صاحب لفٹنٹ گورنر کے میر منشی تھے ۔ اور غالب کو ان سے حصول مقاصد کی امید تھی ۔ اور صاحبان انگریز کی آمد و رفت ، تبدیلی اور تعیناتی ۔ مزاج عادت وغیرہ

---

۹۱ غالب نامہ صفحہ ۹۵

۹۲ حالانکہ غالب نے مولوی شہید صاحب کو دیکھا تک نہیں تھا لیکن قتیل کے تعلق کی وجہ سے وہ ان کے بھی دشمن ہو گئے تھے ۔ منشی حبیب اللہ ذکا حیدر آبادی کو لکھتے ہیں "صفت سہل ممتنع میں میں نے نواب مختار الملک (سر سالار جنگ) کو قصیدہ بھیجا ۔ کچھ قدردانی نہ فرمائی ۔ رد فرقہ وہابیہ میں ایک مثنوی محی الدولہ کو بھیجی ۔ رسید نہ آئی ۔ اب سنتا ہوں کہ مولوی غلام امام شہید شاگرد قتیل وہ ان کو اس اندلا غیری بجا رہے ہیں اور سخن ناشناسوں کو اپنا زور طبع دکھا رہے ہیں" لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ یہی لوگ جن کو مرزا دادخواہی کے طور پر مولوی شہید کے خلاف لکھتے تھے اصل میں مولوی شہید صاحب کے بے حد معترف تھے اور غالب کی نفرین کے باوجود ان کی بہت (بقیہ ص۷۴ پر)

ان کے ذریعہ معلوم ہوتا رہتا تھا۔[1] چنانچہ مرزا ان سے خوب نبھائے ہوئے تھے بلکہ خاصے خوشامدانہ خط لکھتے رہتے تھے۔

موید البرہان کے جواب میں مرزا نے تیغ تیز لکھی اور ایک فارسی قطعہ بھی صاحب موید کو لکھ بھیجا۔ جس میں یہ نئی منطق چھانٹی کہ میں گالیاں دوں تو مجھے روا ہے۔ لیکن تم کو ایسا نہیں چاہیئے۔ اس قطعہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

(بسلسلہ صفحہ گذشتہ) قدر کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک بار یہی منشی حبیب اللہ ذکا مرزا غالب سے مولوی شہید ہی کے سلسلے میں خفا بھی ہو گئے۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک بار ذکا نے شہید کی غزل پر غزل لکھ کر غالب کو بھی۔ مرزا غالب نے غزل پر اصلاح تو دیدی لیکن خبر نہیں خط میں مولوی شہید کو کیا کچھ لکھ دیا کہ منشی حبیب اللہ صاحب ذکا کو بہت ناگوار گذرا۔ بلکہ کسی سے مرزا کی شکایت کی اور اپنی اہانت کا گلہ کیا۔ خواجہ غلام غوث بیخبر کو یہ معلوم ہوا تو وہ بیچ میں پڑے اور فریقین کو کچھ لکھ لکھا کر صلح صفائی کرادی۔

اصل میں مرزا غالب کو ہر اس شخص سے اللہ واسطے کی دشمنی ہو جاتی تھی جس کا دور دراز کا بھی کچھ تعلق قتیل سے ہو جاتا تھا۔ مولوی غیاث الدین رام پوری مولف غیاث اللغات نے اپنی لغت دیباچہ میں جہاں اور کئی ایک ماخذ گنوائے ہیں وہاں مرزا قتیل کی کتاب چار شربت کا بھی حوالہ دیا ہے۔ بس اس خطا پر غالب نے بے چارے مولوی صاحب کو جاو بے جا ہی کر رکھ دیا۔ فرماتے ہیں "غیاث الدین رام پور ایک ملائے مکتبی تھا۔ ناقل نہ عاقل جس کا ماخذ اور مستند قتیل کا کلام ہو گا اس کا فن لغت میں کیا فرمایا ہو گا" (بنام قاضی عبدالجمیل)

[1] غالب از مہر صفحہ ۲۳۲

خرفاء — مرزداری

باقتیل و جامع برہان و لالہ ٹیک چند ؎ لابہ و دسوگیری ولطف ومدارا کردہ است

انتقام جامع برہانِ قاطع می کشند ؎ آنچہ ما کردیم با دے خواجہ با ما کردہ است

من سپاہی زادہ ام گفتار من باید درشت ؎ ولے بر شے گر بہ تقلید من اینہا کردہ است

غرضکہ مرزا غالب اسی قسم کے بے بنیاد الزاموں اور بے دلیل دعووں سے مرزا قتیل کا فاکہ اڑانا چاہتے تھے۔ کہیں اپنے شاگرد کو لکھتے ہیں "کہ قتیل اساتذہ سلف کے کلام سے قطعاً آشنا ہی نہیں"۔ اپنے ایک ذی علم غائبانہ دوست مولوی صاحب عالم صاحب کو لکھا ہے "عقل کو کام میں لاؤ غور کرو۔ سمجھو قتیل بر سمانہ تھا .... میں یزید نہیں ہوں پھر انہی صاحب سے ارشاد ہوتا ہے۔ کہ "قتیل تو اس قابل بھی نہیں کہ اس کا نام لیجئے" اس پر صاحب عالم صاحب بگڑتے ہیں اور غالب کو مدت تک خط نہیں لکھتے۔ قاضی عبدالجمیل بریلوی کی غلطی نکالتے ہیں اور تضحیک کے طور پر کہتے ہیں "یہ فارسی لالہ قتیل کی ہے" میر مجروح کو لکھتے ہیں "تم اردو میں مرزا قتیل بن گئے ہو۔ اردو بازار میں نہر کے کنارے رہتے رہتے رود نیل بن گئے ہو" اپنے ایک لائق شاگرد قدر بلگرامی کو اصلاح دیتے وقت عاجز ہو کر کہتے ہیں "مگر یہاں شیوۂ قتیل بندہ مجبورم۔ یہاں سکہ قتیل"

مرزا غالب کے مرزا قتیل پر اعتراضات

گالیاں تو سن لیں۔ اب آئیے دیکھیں مرزا غالب نے قتیل کی واقعی کیا کیا غلطیاں پکڑی ہیں اور اس عیب جوئی میں وہ کہاں تک حق بجانب تھے۔ ہم ان کو سلسلہ وار عرض کرینگے:-

(۱) مرزا قتیل اساتذہ کے کلام سے ناآشنا ہیں۔ مرزا غالب فرماتے ہیں:-

"قتیل اساتذہ سلف کے کلام سے قطعاً آشنا ہی نہیں۔ اس کے علم فارسی کا ماخذ ان لوگوں کی تقریر ہے جو کہ نواب سعادت علی خاں کے وقت میں ممالک مغربی کی طرف سے لکھنؤ میں آئے اور ہنگامہ آرا ہوئے۔ بیشتر سادہ کشمیری یا کابلی و قندھاری و کرانی احیاناً کوئی عامہ اہلِ ایران میں سے بھی کوئی ہو۔ مانا کہ عقلائے ایران میں سے بھی کوئی ہوگا"

(بنام چودھری عبدالغفور سرور)

(۲) مرزا قتیل نے تحریر کو تقریر جیسا بنا دیا۔ مرزا غالب فرماتے ہیں:-

"تقریر اور ہے تحریر اور ہے۔ اگر تقریر بعینہٖ تحریر میں آیا کرے تو خواجہ وطواط اور شرف الدین علی یزدی اور ملا حسین واعظ کاشفی اور طاہر وحید یہ سب نثریں کیوں خونِ جگر کھاتے وہ سب اسی طرح کی نثریں جو لالہ دلوالی سنگھ قتیل متوفی نے بہ تقلید اہلِ ایران لکھی ہیں رقم نہ فرماتے۔"

(بنام چودھری عبدالغفور سرور) پھر فرماتے ہیں:-

"مگر یہ پیروی قتیل کی ہے کہ وہ ایرانیوں کی تقریر کے موافق تحریر بناتا ہے" (بنام قدر بلگرامی)

(۳) مرزا قتیل کا دعویٰ ہے کہ "کدہ" کا لفظ سوائے پانچ اسماء کے اور کسی سے ترکیب نہیں پاتا۔ مرزا غالب نے چودھری عبدالغفور سرور کو لکھا ہے:-

"یہ شخص (قتیل) مدعی ہے کہ کدہ کا لفظ سوائے پانچ چار اسم کے اور اسم کے ساتھ ترکیب نہیں پاتا۔ پس آرزو کدہ، دلیہ کدہ اور نشتر کدہ اور امثال اس کے جو ہزار جگہ اہلِ زبان کے کلام میں آیا وہ نادرست ہے۔

میں اور آپ بیٹھیں اور اس کے خرافات پڑھے جائیں اور جو میں کہوں اس پر حضرت غور فرمائیں تب معلوم ہو کہ یہ کتنا لغو اور فارسی دانی سے کتنا بیگانہ ہے" منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں :-

" اور یہ اُلّو کا پٹھا قتیل صفوتکدہ و شفقت کدہ و نشتر کدہ کو اور ہمہ عالم و ہمہ جا کو غلط کہتا ہے"

(۴) اقسام نثر بتلانے میں قتیل نے غلطی کی اور مرجز و مسجع کا فرق ٹھیک نہیں بتایا۔ غالب فرماتے ہیں :-

" الفاظ فقرتین وزن میں برابر ہوں وہ مسجع۔ اس صنعت کو بیشتر نثر مقفیٰ میں صرف کرتے ہیں اور چاہو قافیے کا التزام نہ کرو۔ بہر رنگ اقسام ثلثہ نثر یہی ہیں۔ حضرت نے نثر مسجع کو نثر مرجز لکھا ہے۔ جواب وہی ہے کہ اگر مرجز یہ ہے تو مسجع کس نثر کو کہتے ہیں۔ اس سے زیادہ نہ مجھ کو علم نہ یارائے کلام قتیل لکھنوی اور غیاث الدین ملائے مکتبی رام پوری کی قسمت کہاں سے لاؤں کہ تم جیسا شخص میرا معتقد ہو اور میرے قول کو معتمد سمجھے" (بنام چودھری عبدالغفور سرور)

(۵) قتیل کو ایطائے جلی و خفی کی صحیح تعریف معلوم نہ تھی۔ غالب فرماتے ہیں :-

" اگر مطلع میں آپڑے تو ایطائے جلی ہے اور اگر غزل یا قصیدہ میں بطریق تکرار قافیہ میں آپڑے تو ایطائے خفی .... اصل فارسی کو اس کھتری بچے قتیل علیہ ما علیہ نے تباہ کیا۔ رہا سہا غیاث الدین رامپوری نے کھو دیا۔ ان کی قسمت کہاں سے لاؤں کہ صاحب عالم کی نظر میں اعتبار

پاؤں خالصاً للہ غور کرو کہ وہ خران نامشخص کیا کہتے ہیں اور میں خستہ و دردمند کیا بکتا ہوں۔ واللہ نہ قتیل فارسی شعر کہتا ہے۔ اور نہ غیاث الدین فارسی جانتا ہے۔ میرا یہ خط پڑھو۔ یہ نہیں کہتا کہ خواہی نخواہی پڑھو۔ قوت ممیزہ سے کام لو۔ ان غولوں پر لعنت کرو سیدھی راہ پر آجاؤ۔ اگر نہیں آتے تو تم جانو۔ تمھاری بزرگی پر اور مرزا تفتہ کی نسبت پر نظر کر کے لکھا ہے۔ نہیں کہتا کہ خواہی نہ خواہی میری تحریر کو مانو۔ مگر اس کھتری بچہ اور اس معلم سے مجھ کو کمتر نہ جانو" (بنام صاحب عالم صاحب)

(۶) قتیل کا اجتہاد ہے کہ ہمہ کے لفظ کو جمع کے ساتھ لاؤ، مفرد سے نہ ملاؤ۔ ہمہ عالم۔ ہمہ روز۔ ہمہ جا غلط ہے۔ مرزا غالب فرماتے ہیں:۔

"منشائے اعتراض یہ ہے کہ عالم مفرد ہے اسکا ربط ہمہ کے ساتھ بحسب اجتہاد قتیل ممنوع ہے۔ قضارا اس زمانے میں شاہزادہ کامران درانی کا سفیر گورنمنٹ میں آیا تھا کفایت خاں اس کا نام تھا۔ اس تک یہ قصہ پہنچا۔ اس نے اساتذہ کے پان سات شعر ایسے پڑھے جس میں ہمہ عالم و ہمہ روز و ہمہ جا مرقوم تھا۔ اور وہ برہان قاطع میں مندرج ہیں" (بنام مولوی عبدالرزاق شاکر)

(۷) مرزا قتیل نے لکھا ہے کہ جامہ گذاشتن بمعنی مردن گو صحیح ہے لیکن موقعہ دیکھ کر اور احتیاط سے استعمال کیا کرو۔ مرزا غالب فرماتے ہیں:۔

"کالپی کے نواب زادوں میں سے ایک صاحب قتیل کے شاگرد تھے۔ میں نے ایک رقعہ قتیل کا ان کے نام دیکھا ہے۔ قتیل ان کو لکھتا ہے کہ جامہ گذاشتن بمعنی مردن مسلم لیکن بہت احتیاط کیا کرو۔ موقعہ دیکھ لیا کرو

جب لکھا کرو۔ میں کہتا ہوں کہ احتیاط کیا اور موقعہ کیا؟ (بنام چودھری عبدالغفور سرور)

(۸) مرزا قتیل کا شعر ہے ؎

یک وجب صبائے کمیئے تو زخون پاک نبود ٭ کشتہ برکشتہ تپاں بود گر خاک نبود

اس میں ہیچ نہ بود کی جگہ خاک نہ بود لکھا ہے۔ اُردو محاورے کا ترجمہ ہے فارسی میں اس طرح نہیں بولا جاتا۔

مرزا غالب کہتے ہیں :-

"ہندی میں کچھ نہیں کی جگہ خاک نہیں بولتے ہیں۔ فارسی میں ہیچ نیست کی جگہ خاک نیست کوئی نہیں کہے گا قتیل چاروں خانے چت گرا۔ ع کشتہ برکشتہ تپاں بود گر خاک نہ بود۔ یعنی ہیچ نہ بود۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ" (بنام قدر بلگرامی)

اعتراضات کے جواب یہ ہیں وہ آٹھ اعتراضات جو مرزا غالب نے مرزا قتیل پر وارد کئے ہیں۔ ان کے علاوہ ہمیں باوجود تلاش کوئی اور ایسا اعتراض نہ مل سکا جو مرزا غالب نے قتیل پر کیا ہو۔ اب ہم ان کو بالترتیب جانچیں تولیں گے۔

(۱) قتیل اساتذہ کے کلام سے آشنا نہیں۔ مرزا غالب نے اپنے اس اعتراض کی کوئی وجہ یا کوئی ثبوت نہیں دیا ہے۔ خبر نہیں انھوں نے یہ نتیجہ کیونکر نکالا۔ مرزا قتیل کی تصانیف عام طور سے اس وقت ملتی تھیں اور اگر مرزا غالب اس "حسن ظن" سے کام نہ لیتے اور واقعی مرزا قتیل کی کتابوں کو ایک نظر دیکھ جاتے تو یقیناً یہ ان کے لئے مفید ہوتا۔ اس الزام اور اتہام کے بارے میں سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے

که اہلِ انصاف آج بھی مرزا قتیل کی کتابوں خصوصاً شجرۃ الامانی، چار شربت اور نہر الفصاحت کو دیکھ لیں اور خود فیصلہ کریں۔ میرا خیال ہے کہ صرف چار شربت ہی میں اس قدر مصالحہ ہاتھ آجائے گا کہ پھر مجھے تردید کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔ اگر تطویل لاطائل کا خوف نہ ہوتا تو میں حوالے دیکر عرض کرتا کہ مرزا قتیل نے شاید ہی اساتذہ متقدمین و متاخرین میں سے کسی کو فراموش کیا ہو۔ نظم و نثر فارسی پر جس قدر ان کو عبور حاصل تھا وہ واقعی حیرت میں ڈالتا ہے۔ مرزا قتیل کی کتابیں گذشتہ صدی کی فارسی کی صرف و نحو۔ صنائع بدائع زبان دانی کی بہترین کتابوں میں سے ہیں۔ انھوں نے ایران کے مختلف حصوں کی زبان اور محاورے کو کماحقہٗ سمجھا اور بتایا ہے۔ اور اساتذہ کے کلام اور تحریرات سے جس قدر استناد کیا ہے اس کا جواب مشکل سے ملتا ہے۔ ان کی کتابوں کے علاوہ بھی اس کا کافی ثبوت موجود ہے کہ قتیل اساتذہ کے کلام سے نہ صرف واقف تھے بلکہ اس کا بیشتر حصہ ان کو مستحضر تھا۔ اور انھی کی تحریک و تائید سے فارسی شعرا کے کم از کم دو موقر و مستند تذکرے لکھے گئے۔ احمد علی ہاشمی نے تذکرۂ مخزن الغرائب تین جلدوں میں لکھا۔ احمد علی ہاشمی خود بھی جہاندیدہ آدمی تھے۔ چالیس سال کے قریب علما اور ادبا کی صحبتوں میں گذارے تھے۔ کہتے ہیں "شب و روز در یک جا با مردم خراسان و عراق و فارس صحبت گرم می داشتم تا از برکتِ صحبتِ فیض و مجالستِ ایشاں بے بہرہ نماندم کم و بیش پے بمحاورہ فارسی بردم و درمیان سیاہ و سفید فرق توانستی کرد"[1]۔ مخزن الغرائب کا سبب

---

[1] دیباچہ تذکرہ مخزن الغرائب جلد اول۔ نسخہ قلمی موجودہ لائبریری ریاست حبیب گنج نمبر ۵۱/۱ ج

تالیف اس طرح بیان کرتے ہیں "استادی افصح الفصحا و اکمل البلغا مرزا
محمد حسن المتخلص بہ قتیل کہ بواقعی کشتۂ راہ دوست است و رضاعت براعت
کلام اگر رئیس شیرواں زندہ بودے بشاگردیش اقرار نمودے و در جزالت
و سلاست عبارت اگر حکیم خاوراں زندہ گشتے بملک الشعرائے او در بر داشتے
و فصاحت و بلاغت کسب کردے فرمود کہ اشعار از ہر قسم بسیار سر بہم
شدہ اگر بطرز تذکرہ و طریق تہجی رعایت کردہ آید چہ کہ خوانندۂ ایں بآسانی
ہر کدام شاعر را کہ بخواہد اشعارش برآوردہ بخواند. بصواب نزدیک تر است
بحسب فرمودۂ آں وحید عصر ایں جواہر زواہر بطریق تہجی در رشتۂ تحریر کشیدہ آمد"
اسی طرح مصحفی کا تذکرہ عقد ثریا بھی مرزا قتیل کی تحریک پر ہی لکھا گیا۔ بدقسمتی
سے جو نسخہ حال میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ اس میں
وہ تمام تفصیلات شامل نہیں ہیں جو اس کے دوسرے قلمی نسخوں میں پائی جاتی
ہیں۔ مولوی عبدالمالک صاحب آروی نے پٹنہ اورنٹیل لائبریری کے مخطوطے
کے حوالے سے لکھا ہے کہ "مصحفی نے دیباچہ میں اس کی تصریح کر دی ہے
کہ مرزا محمد حسن قتیل کی ترغیب سے انھوں نے عقد ثریا کی ترتیب دی۔
بہت سا مواد بھی مرزا قتیل ہی نے دیا[۵]"۔ مرزا غالب کا یہ کہنا کہ قتیل اساتذہ
کے کلام سے ناآشنا تھے دعوئے بے دلیل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا

(۲) مرزا قتیل نے تحریر کو تقریر جیسا بنا دیا۔

یہ بھی کچھ عجب اعتراض ہے۔ خود مرزا غالب پنج آہنگ میں یہ تسلیم

---

[۵] رسالہ نگار۔ فروری ۱۹۳۹ء۔ صفحہ ۱۰

فرماتے ہیں:-

"نگارش را از گذارش دورتر نبرده رنگِ گفتن دہد و مطلب را بداں روش گذارد کہ دریافتن آں دشوار نہ بود"

غالب کا اعتراض یہ ہے کہ "جام کی جگہ جامک نہ لکھو۔ یہ طرز قتیل کی ہے کہ وہ ایرانیوں کی تقریر کے موافق تحریر بناتا ہے" (بنام قدر بلگرامی)

اول تو یہ کہیں ثابت نہیں کہ مرزا قتیل نے کہیں جام کو جامک یا جاگی لکھا ہو۔ مرزا غالب نے خواہ مخواہ مرزا قتیل پر منڈھ دیا ہے۔ اور یہ ان کا معمول تھا کہ جہاں غلط فارسی دیکھی اور انھوں نے قتیل پر الزام رکھا[1]

اس کے علاوہ خود مرزا بھی اس قسم کے تصرفات سے نہیں چوکتے۔ مرزا تفتہ کو ایک دفعہ اصلاح دی اور "تازہ نگاہ" کی جگہ "نیم نگاہ" بنایا۔ اس سے شاید تفتہ مطمئن نہ ہوئے اور سند مانگی۔ اس پر مرزا غالب فرماتے ہیں "نیم نگاہ و نیم گناہ و نیم ناز یہ روزمرہ اہلِ زبان ہے۔ نیم بمعنی اندک ورنہ گناہ کا آدھا اور نگاہ کی ادھوائی اور ناز آدھا یہ مہملات ہیں۔ ان چیزوں کا مناصفہ کیا۔ اگر تم کو نیم نگاہ پسند تازہ نگاہ رہنے دو۔"

---

[1] مثلاً قاضی عبدالجمیل صاحب نے مرزا غالب کو خط لکھا اور اس میں مرزا کا وہ قطع جس کو وہ اپنی وفات کی تاریخ بتاتے تھے نقل کیا۔ پہلا مصرع انھوں نے اس طرح سے لکھ دیا ع کیستم من کہ تا ابد بزیم۔ اس پر مرزا غالب لکھتے ہیں:- لاحول ولا قوۃ۔ یہ مصرع میرا نہیں "تا ابد بزیم" یہ فارسی لاقتیل کی ہے۔ میرا قطع یہ ہے سے کیستم من کہ جاوداں باشم ... الخ"

خود مرزا غالب نے اپنی اُردو رقعہ نگاری کی تعریف یہی کی ہے کہ "مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا"۔ پھر اگر یہی خوبی مرزا قتیل نے پیدا کی تو کون گناہ کیا۔ مرزا غالب یہ بھی فرماتے ہیں کہ خواجہ وطواط شرف الدین علی یزدی، ملا حسین واعظ کاشفی اور طاہر وحید نے نثر میں خونِ جگر کھایا ہے اگر قتیل کی طرز جو انھوں نے بہ تقلید اہلِ ایران نکالی مستحسن ہوتی تو یہ سب بھی ایسی ہی نثریں لکھتے۔ یہ بھی عجب استدلال ہے کہ چونکہ ایک شخص پرانی طرزِ تحریر کی کورانہ تقلید نہیں کرتا اور قواعد میں رہتے ہوئے اپنے لئے ایک نئی راہ نکالتا ہے تو وہ مردود۔ اور پھر یہ استدلال مرزا غالب کی جانب سے تو عجب ستم ظریفی اپنے اندر رکھتا ہے۔ مرزا غالب جو ادب میں اصلاح کے علمبردار اور اندھی تقلید کے سب سے بڑے دشمن سمجھے جاتے ہیں وہی کہہ رہے ہیں جس کے خلاف کہا جاتا ہے کہ انھوں نے جنگ بغاوت کا اعلان کر رکھا تھا۔ اصل میں مرزا غالب خود ہی جہاں تک ان کے ارادے کا تعلق ہے پرانی لکیر کے فقیر تھے۔ وہ بھی قدما کی طرح فارسی میں اپنی تحریروں کو جان جان کر مشکل بنانا پسند کرتے تھے۔ اس میں ان کو بڑا مزا آتا تھا کہ آسانی سے ان کی بات سمجھ میں نہ آئے گویا ان کی بات آسانی سے سمجھنا ایک جرم تھا۔ اور اس میں وہ اپنی اہانت سمجھتے تھے مشکل مطلب کو ثقیل اور نامانوس الفاظ میں صنائع بدائع کے زیور سے آراستہ کرکے پیش کرنا ہی وہ اپنا فرضِ منصبی سمجھتے تھے۔ اور اس طریقہ سے پڑھنے والے پر وہ اپنا سکہ جمانا چاہتے تھے۔ وطواط، طاہر وحید، ظہوری، ابوالفضل اور بیدل کا بھی یہی انداز ہے۔ ہر چند کہ رنگ ہر ایک کا الگ ہے مگر اشکال سب

میں مشترک ہے۔ مرزا غالب کی فارسی نثر کی دونوں کتابیں (مہر نیمروز اور دستنبو) اسی قبیل کی کتابیں ہیں اور سچ یہ ہے کہ ان پر پیاز کی مثل بالکل صادق آتی ہے کہ چھلکے ہی چھلکے ہیں مغز کا نام نہیں۔ وہ تو یوں کہئے کہ بلا ارادہ جو اردو کے خطوط انھوں نے لکھے ان کی وجہ سے مرزا غالب کی نثر نگاری کی یہ تعریفیں ہیں یہ خطوط انھوں نے قطعی سرسری طور پر اور بغیر اس علم کے لکھے تھے کہ کسی وقت یہ شائع بھی ہوں گے اور اسی لئے وہ ان کو چھپوانے کے شروع شروع میں مخالف بھی تھے۔ خود کہتے ہیں "کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا۔ ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کی منافی ہے۔" لیکن یہی تحریر سرسری ان کی شہرت کا باعث ہے۔ ورنہ وہ ارادے سے ایسا لکھنے کے اہل ہی نہ تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ فیصلہ کرنے کے بعد کہ رقعات چھپوائے جائیں گے اور جو رقعات انھوں نے اس نیت سے لکھے کہ وہ اس مجموعہ میں شامل ہوں وہ پہلے رقعوں کے مقابلے میں بہت کم درجے کے ہیں[1]۔ اس کے علاوہ جب مسٹر اسٹورٹ ریڈ نے مرزا سے اردو قصہ لکھنے کے لئے کہا تو اس اردو نثر کے موجد سے ایک قصہ نہ لکھا گیا۔ لکھتے ہیں :۔

"جناب ریڈ صاحب صاحبی کرتے ہیں میں اردو میں اپنا کمال کیا ظاہر کر سکتا ہوں۔ اس میں گنجائش عبارت آرائی کی کہاں ہے" (بنام منشی شیو نراین)

"میاں اردو کیا لکھوں۔ میرا یہ منصب ہے کہ مجھ پر اردو کی فرمائش ہو"

(بنام منشی شیو نراین)

---

[1] مثلاً رقعہ بنام مرزا رحیم بیگ صاحب ساطع برہان

"بھائی تم غور کرو اُردو میں اپنے قلم کا زور کیا صرف کروں گا اور اس عبارت میں معانی نازک کیونکر بھروں گا" (بنام منشی شیو نرائن)

غرضکہ یہ بالکل یقینی بات ہے کہ مرزا کا اپنا رنگ وہی اشکال اور تصنع کا رنگ تھا جس میں چھلکے کے علاوہ مغز کا نام نہ ہو۔ اور یہ جو اُردو کے رقعے لکھے گئے جو انکی شہرت کا باعث ہوئے وہ مطلق بے ارادہ بلکہ خلاف ارادہ تحریر کا نمونہ ہیں۔ مختصر یہ کہ مرزا غالب اسی دقیانوسی طرز تحریر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اور وہ قتیل کی تحریر کی کماحقہٗ قدر کر ہی نہیں سکتے تھے۔ قتیل کی سادگی تحریر بالارادہ تھی نہ بوجہ عجز۔ چار شربت میں جہاں انھوں نے نثر کی اقسام ثلثہ بتائی ہیں وہاں عاری کی تعریف اس طرح کرتے ہیں" عاری عبارت از نثرے باشد کہ از وزن و قافیہ و دیگر تکلفات معریٰ بود و ایں بسیار مشکل است آسان نیست۔ بیشتر صاحبان دریں مقام عاجز اند"[۵۱] خود مرزا غالب بھی سہل ممتنع (جو عاری ہی کی ایک قسم ہے) کی مشکلات سے پوری طرح واقف تھے۔ چودھری عبدالغفور سرور کے نام کے رقعہ میں فرماتے ہیں" سعدی کی طرز نے بسبب سہل ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا" پھر کہتے ہیں "سہل ممتنع اس نظم و نثر کو کہتے ہیں کہ دیکھنے میں آسان نظر آئے اور اس کا جواب نہ ہو سکے" یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اپنے لئے سادہ طرز کا انتخاب مرزا قتیل نے بجت اور آسانی کے خیال سے کیا تھا۔ چار شربت ہی میں انھوں نے ہر سہ اقسام نثر (عاری مسجع۔ مرجز) میں فاضلانہ۔ صوفیانہ و منشیانہ طرز تحریر کی بسیط

---

۵۱ چار شربت صفحہ ۵۹

مثالیں دی ہیں ۔ پھر اس کے بعد وصاف ۔ شرف الدین علی یزدی ۔ خواجہ محمود گیلانی ۔ ابوالفضل ۔ ظہوری ترشیزی ۔ مرزا عبدالقادر بیدل، طاہر وحید اشرف ۔ مرزا مہدی اور منشی صاحب عالم کی طرزِ تحریر کو بالتفصیل بتایا ہے کہ ان میں کیا کیا خصوصیات ہیں اور پھر ہر ایک کی طرز میں مثالاً ایک ایک مفصل عبارت لکھی ہے[51] ۔ پھر یہ دکھا کر کہ ان کا قلم ان سنگلاخ وادیوں سے یکساں روانی کے ساتھ گذرنے پر قدرت رکھتا ہے انھوں نے اپنے لئے سادہ طرزِ تحریر پسند کی ۔ اور یہی اس کی انتہائی تعریف ہے ۔ شیخ رحمت اللہ ثمراۃ البدائع کے دیباچہ میں لکھتے ہیں ۔

" رقعاتش (رقعات قتیل) چوں دلق سالکان مسالک تجرید از آلائش تکلف مبرا است و شاہدان سبز فام نقرآتش بسانِ اسرار رہ نمایانِ طرق توحید ہوش ربا و حیرت افزا شیفتہ گرد ید[52] "

اصل میں جو سادگی اور برجستگی غالب کے اردو رقعوں میں پائی جاتی ہے (اور جس کو وہ فارسی میں پیدا نہ کر سکے) وہی فارسی میں قتیل کی خصوصیت ہے ۔ یہ بڑے تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ غالب جن کی شہرت بحیثیت ایک نثر نگار ان کے اردو کے رقعات کی سادگی اور بے ساختگی پر موقوف ہے وہ قتیل کی نثر پر انہی خصوصیات کے موجود ہونے کی بنا پر اعتراض کریں ۔

---

[51] چار شربت صفحہ ۵۹ تا ۶۰

[52] ثمراۃ البدائع صفحہ ۲

(۴) قتیل کے بقول کدہ کا لفظ صرف پانچ اسماء سے ترکیب پاتا ہے۔

مرزا غالب نے اپنے خطوط میں متعدد جگہ بڑے بڑے اور اکثر بُرے بُرے الفاظ کے ساتھ مرزا قتیل کی یہ "غلطی" ظاہر کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ اس اجتہاد کی بنا پر نشتر کدہ وغیرہ غلط ٹھیرتے ہیں گو یہ ترکیبیں متقدمین و متاخرین نے بکثرت استعمال کی ہیں۔ افسوس کہ مرزا غالب نے یہاں بھی حسب معمول بغیر حوالہ دیئے اور بغیر تحقیق کئے اعتراض جڑ دیا۔ خبر نہیں مرزا غالب کو اس طرح بسندیوں کی طرح آدھی ادھوری باتوں پر اعتراض کر بیٹھنے میں کیا لطف آتا تھا۔ محض مذاح کے لئے ایسا ہو تو خیر جائز ہے۔ مثلاً انکا وہ قطعہ ؎

برخاست است گرد ز سرچشمۂ حیات — در حافظہ نماند نمے در سبو مرا
لاتقربوا الصلوٰۃ زنہیم بخاطر است — وز امر یادماندہ کلوو اشربو مرا

لیکن جب سنجیدہ گفتگو اور معاندانہ و مخالفانہ تحریر ہو تو یہ ادھیچے تیر اکثر آ لٹے پڑتے ہیں کدہ کی بحث مرزا قتیل نے نہر الفصاحت صفحہ ۲۵ پر کی ہے۔ مرزا غالب کے اعتراض کا جواب شاید اس سے بہتر ممکن نہ ہو کہ میں نہر الفصاحت کی اصل عبارت معہ تشریح ناظرین کے سامنے رکھ دوں۔ مرزا قتیل کہتے ہیں :-

دیگر کدہ بمعنی خانہ باشد با پنج لفظ ملحق شدہ سوائے آن مسموع نیست بت کدہ و غم کدہ و آتش کدہ و مے کدہ و گلشن کدہ و غیر آں چوں آب کدہ نمی دانم کہ درست است یا نادرست۔ ف یعنی ایں ۵ اصول اند و سوائے ایں

نچ آنچه در کلام اساتذہ یافتہ باشد فرع این ہا باشد۔ حصر مقصود نیست و فروع
در اصل داخل است چوں حیرت کدہ و سنبل کدہ و ویران کدہ و حسرت کدہ و ماتم کدہ
و راحت کدہ و تغافل کدہ و جہنم کدہ و بہشت کدہ و ہر دو در گلشن کدہ داخل است
چرا کہ گلشن جائے گل معنی بود و ماتم کدہ و عشرت کدہ و محنت غم کدہ داخل اند و ل
مرادف بمعنی ندیم بسبب ضد بودن۔ نظر بر نظیر است۔"

(۴) مرزا قتیل نے اقسام نثر کی تعریف میں غلطی کی

یہ اور اس سے اگلا اعتراض مرزا غالب کی علمیت کو ضرورت سے زیادہ عریاں کئے دیتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی بھی سمجھ دار آدمی کیونکر اس معاملے میں اس انداز سے نکتہ چینی کر سکتا تھا۔ لطف تو یہ ہے کہ مرزا غالب نے جو تعریف اقسام نثر کی کی ہے اور اپنے نزدیک قتیل کو اصلاح دی وہ غلط ہے اور مرزا قتیل کی تعلیم صحیح۔ لیکن پھر بھی مرزا غالب نے اس قدر سختی اور درشتی سے مرزا قتیل کا ذکر اس ضمن میں کیا ہے کہ معاذ اللہ۔ کھتری بچہ' خر' ناشخص وغیرہ سب ہی کچھ کہہ ڈالا۔ میرا خیال ہے کہ اس زور شور کی وجہ ہی یہ تھی کہ مرزا اس جگہ بالکل ہی ضعیف بنیادوں پر تھے۔ اور ان کو خود اس کا احساس تھا دلیل کی کمزوری کو وہ گفتگو کی تیزی اور تلخی سے پورا کرنا چاہتے تھے۔ اور سائل کو مطمئن نہیں بلکہ مرعوب کر دینا چاہتے تھے۔ یہ ایک نہایت دلچسپ نفسیاتی مسئلہ ہے۔ دکاندار اپنی دکان کی ناکارہ اور کم حیثیت چیز کی سب سے زیادہ تعریف کرتا ہے تاکہ بکے۔ اچھی چیزیں تو خود بخود بک ہی جاتی ہیں۔ یہی صورت مرزا غالب کی تھی۔ قصہ یہ ہوا کہ چودھری عبدالغفور سرور اور صاحب عالم صاحب نے نثر کی اقسام ثلثہ دریافت کیں۔ مرزا غالب نے لکھا

"وزن نہ ہو قافیہ ہو وہ مقفٰی۔ وزن ہو قافیہ نہ ہو وہ مرجز ہے۔ الفاظ فقرتین وزن میں برابر ہوں وہ مسجع۔ اس صنعت کو بیشتر نثر مقفٰی میں صرف کرتے ہیں۔ اور جا ہو قافیہ کا التزام نہ کرو۔" یہ تعریف چودھری صاحب و صاحب عالم صاحب کو مطمئن نہ کر سکی انھوں نے قتیل کی بتائی ہوئی تعریف لکھی ہوگی جس پر غالب چراغ پا ہو گئے۔ اب آیئے دیکھیں مرزا قتیل نے کیا تعریف کی ہے اور ان میں کونسی صحیح ہے۔ مرزا قتیل نے چار شربت صفحہ ۹ ۵ پر اقسام ثلثہ نثر اس طرح بیان کی ہیں۔" نثر را سہ گونہ بنا گذاشتہ اند، عاری و مسجع و مرجز۔ عاری عبارت از نثرے باشد کہ از وزن و قافیہ و دیگر تکلفات معرّیٰ بود......... و مسجّع نثریست کہ آخر فقرۂ آں بلفظے آرند و مقابل آں لفظ در فقرہ دیگر بلفظے باشد کہ در روی و ردف و ردفین و تاسیس و دخیل و حرف وصل و غیر آں موافق بایں لفظ باشد (یعنی ہم قافیہ ہو) و مقید بوزنے نہ بود۔ و مرجز نثرے باشد کہ از قافیہ پاک بود اما فقرۂ اولیٰ با فقرۂ ثانی مساوی الوزن باشد" یعنی عاری وہ جس میں نہ وزن نہ قافیہ، مسجع وہ جس میں وزن نہ ہو قافیہ ہو۔ اور مرجز وہ جس میں قافیہ نہ ہو وزن ہو۔ یہی اقسام ثلثہ نثر ہیں۔ اب اس کا مقابلہ مرزا غالب کی بتائی ہوئی تعریف سے کیجئے۔ مرجز کی تعریف تو دونوں کی ایک سی ہے۔ عاری مرزا غالب نے اس جگہ بتائی ہی نہیں۔ اس کو جانے دیجئے۔ اب سوال مسجع کا ہے۔ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہ ہوگا کہ مرزا غالب کی بتائی ہوئی تعریف مسجع کی غلط ہے۔ اصلیت میں مسجع اور مقفٰی میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن یہاں مرزا غالب نے کہا ہے کہ "مسجع وہ جس میں الفاظ فقرتین وزن میں برابر ہوں اور خواہ قافیہ نہ ہو۔" پھر بتایئے کہ

اس میں اور مرجّز میں کیا فرق رہ گیا۔ مرجّز کو مرزا غالب نے بھی لکھا ہے کہ وزن ہو قافیہ نہ ہو۔ مرزا غالب کی بتائی ہوئی مسجع میں جب الفاظ فقرتین وزن میں برابر ہوں گے تو فقرتین بھی یقیناً ہم وزن ہوں۔ اجزا جب ہم وزن ہیں تو کل آپ سے آپ ہم وزن ہوں گے۔ قافیہ کو مرزا غالب مسجع کے لئے ضروری نہیں سمجھتے۔ پھر یہی تعریف وہ مرجّز کی بتلاتے ہیں۔ تو دونوں قسموں میں فرق کیا رہا۔ یہاں یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ مرزا غالب نے مسجع کی تعریف غلط کی مسجع کے لئے وزن کی شرط نہیں صرف قافیہ کی شرط ہے۔ یعنی مقفّیٰ اور مسجع ایک ہی ہیں۔ اگر مرزا غالب کا حافظہ اس معاملے میں اس قدر کھویا ہوا نہ ہوتا تو ان کو یاد آ جاتا کہ وہ خود اس چیز کو اس طرح بتا چکے ہیں۔ چودھری عبدالغفور کے نام ہی ایک اور خط میں لکھتے ہیں " بندے کی تحقیقات یہی ہے کہ نثر تین قسم پر ہے۔ مقفّیٰ قافیہ ہے وزن نہیں۔ مرجّز وزن ہے اور قافیہ نہیں۔ عاری نہ وزن ہے نہ قافیہ۔ مسجع ہی مقفّیٰ ہے۔" اب اس تعریف کو دیکھئے تو بالکل وہی ہے جو مرزا قتیل نے کی ہے۔ پھر مسجع کی غلط تعریف کر کے اور مرزا قتیل سے اختلاف نکال کر ان بے چارے کو خواہ مخواہ مورد الزام کرنا لیکن اصلیت میں خود اپنی ہنسی اڑوانی کیا ضرور تھی۔

(۵) قتیل نے ایطائے جلی و خفی کو سمجھانے میں غلطی کی۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے مرزا غالب اس معاملے میں خواہ مخواہ بے چارے مرزا قتیل کے پیچھے پڑ گئے۔ اور ان غول۔ کھتری بچہ، علیہ ما علیہ سب کچھ کہہ ڈالا۔ یہاں بھی معاملہ یہ تھا کہ انھوں نے صاحب عالم صاحب کی درخواست پر قافیہ شائگان اور خفی اور جلی کا فرق سمجھایا۔ اور جب صاحب عالم صاحب کو

اطمینان نہ ہوا اور انھوں نے قتیل کا غالباً حوالہ دیا تو بس مرزا غالب بگڑ گئے اب آئیے دیکھیں ان حضرات نے کیا کیا فرمایا ہے اور قتیل مرحوم کی کیا ایسی غلطی ہے جس کو مرزا غالب برداشت نہ کر سکے۔

مرزا قتیل نے حسب عادت مختصر لیکن جامع تعریف اس طرح کی ہے:۔

" ایطا جلی باشد و خفی۔ جلی آنست کہ عیاں باشد و در کلام قدما بیشتر است و متاخران بے خبر از فن نیز آوردہ اند و یا کسانیکہ در جمیع مراتب شعر تقلید متقدماں پیش نہاد خاطر شان بودہ مثل شیخ محمد علی حزیں علیہ الرحمتہ می گوید ؎

(اشک کبابم از دلِ سوزاں فرد چکم ؁ خونِ دلم ز دیدۂ گریاں فرد چکم)

ایطائے خفی آن بود کہ زود تر دریافت نشود تا اندکے تامل در آن نہ کنند۔ مانند آب و گلاب و ایں قافیہ را معیوب شمار نہ کردہ اند۔ و نزد فقیر ہیچ گونہ در مطلع جواز ندارد "سلہ

مرزا غالب فرماتے ہیں:۔

" اہلِ خرد نے خاک اڑائی ہے اور بات بنائی ہے خفی اور جلی کی تفسیر میں وہ کچھ لکھا ہے کہ صاحب طبع سلیم کبھی اس کو نہ سمجھے چہ جائیکہ مانے .... اگر یہ (ایطا) مطلع میں آ پڑے تو ایطائے جلی ہے اگر غزل یا قصیدہ میں بطریق تکرار قافیہ میں آ پڑے تو ایطائے خفی ہے" (بنام حسام عالم صاحب)

سلہ چار شربت صفحہ ۲۸ و ۲۹

یہ تو شاید اب کہنے کی بھی ضرورت نہ رہی کہ مرزا غالب کی یہ تعریف ناقص ہے۔ مرزا غالب نے جلی و خفی کی تقسیم اس پر منحصر کی ہے کہ ایطا کہاں وارد ہوتا ہے۔ خود الفاظ کی ساخت اور شکل سے بحث نہیں۔ محض اس کے محل استعمال سے غرض ہے۔ گویا یہ ممکن ہے کہ ایک ہی قسم کا ایطا اگر مطلع میں آئے تو اس کو ایطائے جلی کہیں۔ اور پھر اسی کو اگر وہ اشعار مابعد میں بطریق قافیہ آئے تو ایطائے خفی۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ بعض قوانی ایطائے جلی مانے گئے ہیں اور بعض خفی۔ خواہ ان کا محل استعمال کہیں ہو۔ مطلع میں یا درمیان میں۔ جیسا کہ مرزا قتیل نے بتایا ہے۔ خود مرزا غالب بھی عملاً اس کے قائل تھے۔ مرزا تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"حضرت اس غزل میں پروانہ و پیمانہ و بت خانہ تین قافیے اصلی ہیں۔ دیوانہ چونکہ علم قرار پا کر ایک لغت جداگانہ مشخص ہو گیا ہے اس کو بھی قافیہ اصلی سمجھ لیجئے۔ باقی غلامانہ و مستانہ و مردانہ و رندانہ و دلیرانہ و شکرانہ "سب ناجائز اور نامستحسن۔ ایطا اور ایطا بھی قبیح" (یعنی ایطائے جلی)

ظاہر ہے کہ یہ سب قافیے مطلع ہی میں تو استعمال نہ کئے گئے ہونگے۔ بلکہ غزل کے دیگر اشعار میں بطریق تکرار قافیہ میں آئے ہوں گے۔ لیکن ان کو مرزا غالب ایطا قبیح فرماتے ہیں۔ یعنی بالفاظ دیگر ایطائے جلی۔ اور یہی ٹھیک بھی ہے۔

(۲) قتیل "ہمہ عالم" "ہمہ جا" "ہمہ روز" وغیرہ کی ترکیب کو غلط بتاتے ہیں:-

اس اعتراض اور اس معرکے کی تفصیل ہم صفحہ ۲۲ تا ۲۷ پر دے چکے ہیں۔ اس بحث کے دو پہلو ہیں۔

(i) کیا قتیل نے "ہمہ عالم" وغیرہ ترکیب کو غلط بتایا۔

(ii) کیا واقعی یہ ترکیب غلط ہے۔

ہم نے دانستہ یہ دو تنقیحیں قائم کی ہیں۔ ہم اشارتاً عرض کر چکے ہیں کہ مرزا قتیل پر یہ بہتان تھا کہ انھوں نے اس ترکیب کو غلط بتایا ہے، ورنہ معترضین کی افترا پردازی کے علاوہ اس کی کوئی اصلیت نہیں۔ جہاں تک ہمیں پتہ چل سکا مرزا قتیل نے ۸ کتابیں لکھی ہیں[۹۱]۔ ہم نے حتی المقدور ان سب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے اور ہمیں یہ کہنے میں مطلق پس و پیش نہیں کہ مرزا مرحوم نے کہیں اس ترکیب کو ناجائز نہیں بتایا۔ نہ صرف یہی بلکہ خود مرزا قتیل نے یہ تراکیب استعمال کی ہیں۔ نثر میں فرماتے ہیں:۔

"ہر گاہ می دانید کہ ہمہ جا بر روئے زمین ہیں آدمیانند"[۹۲]

نظم میں بھی مرزا قتیل نے یہ تراکیب استعمال کی ہیں ؎

تیغ برکش، دست بکشا، چیست بیم از روز حشر
گر دو عالم را بریزی خوں نگاہے خون بہاست[۹۳]

ایک غزل اسی ترکیب کی زمین میں لکھی ہے۔ جس کے دو شعر یہ ہیں ؎

---

[۹۱] ان کے علاوہ ایک فارسی قصہ اور ایک ترکی خطوط کے مجموعہ کا اور پتہ چلتا ہے۔ وہ ہم نے نہیں دیکھے ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان میں فارسی قواعد کا کیوں ذکر ہوگا۔

[۹۲] یہ محض مثالاً لکھا گیا ہے ورنہ انکی کتابوں میں ایسی ترکیبیں ہزاروں اور مل سکتی ہیں۔

[۹۳] یہاں اگرچہ ہمہ عالم نہیں ہے لیکن اعتراض کی بنا پر تو دو عالم کی ترکیب غلط ٹھیرتی ہے کیونکہ اعتراض تو یہ تھا کہ ہمہ جمع ہے اور عالم مفرد اس لئے یہ دو ترکیب نہیں پا سکتے۔

سرِ نقش بود دستِ رقیباں ہمہ شب ٭ من زغم با اجلم دست و گریباں ہمہ شب
نہ من بر سرِ رحم آئے کہ بے چارہ قتیل ٭ می کند نالہ بکوبیت چو گدایان ہمہ شب

پھر یہ کہنا کس قدر ظلم ہے کہ قتیل نے ہمہ عالم۔ ہمہ روز۔ ہمہ جا وغیرہ ترکیبوں کو ناجائز بتایا۔ معترضینِ غالب نے اپنے اعتراض کو وزنی کرنے کے خیال سے غالباً مرزا قتیل کا نام لے دیا ہوگا۔ مرزا غالب نے اور تو بہت سے جواب دیئے۔ لیکن اگر وہ چاہتے تو نہایت مسکت جواب خود قتیل ہی کے شعر سے دے سکتے تھے۔

اب یہ چیز رہ جاتی ہے کہ ممکن ہے مرزا قتیل نے یونہی زبانی اپنی تعلیمات میں اس ترکیب کو غلط اور ناجائز بتایا ہو۔ اگرچہ اس فضول سے امکان پر کسی اعتراض کا دارومدار تو نہیں ہو سکتا۔ لیکن آئیے یہ بھی دیکھ لیں کہ اگر ایسا تھا تو اس کی کیا صورت ہوگی۔

"ہمہ" برائے احاطہ افراد یا برائے شمول اجزا آتا ہے۔ جب برائے احاطہ افراد آئے گا تو ظاہر ہے کہ یہ واحد کے ساتھ ترکیب نہیں کھائیگا مثلاً ہمہ مرداں یا ہمہ چیزہا برخلاف اس کے جب شمول اجزا مقصود ہوگا تو واحد ہی کے ساتھ ترکیب پائیگا۔ مثلاً ہمہ روز یعنی از صبح تا شام تمام روز۔ یا ہمہ عالم یعنی تمام عالم، کل عالم، لیکن اگر برائے احاطہ جمیع عالمین آیا ہے تو ہمہ عالمہا کہنا ہی ٹھیک ہوگا۔ یہ مانا کہ بعض صورتوں میں برائے احاطہ افراد بھی "ہمہ" لفظ واحد سے ترکیب پاتا ہے مثلاً ہمہ کس۔ لیکن یہ مستثنیات میں سے ہے قاعدہ وہی ہے کہ ہمہ برائے احاطہ افراد جمع ہی کے ساتھ ترکیب کھانے لہذا ایک قواعدداں، صرف و نحو کا استاد قاعدے کو قاعدے ہی کی حیثیت

سے بتا سکتا ہے مگر اس میں مستثنیات بھی لاحق ہوتی ہیں ممکن ہے اس صورت سے مرزا قتیل نے سہہ کی تشریح زبانی اپنے شاگردوں کے سامنے کی ہو[1] - اور اگر ایسا کیا ہو تو یہ قابلِ گرفت نہیں مستثنیات سے قاعدہ غلط ثابت نہیں کیا جا سکتا بالکل ایسے ہی جیسے قاعدے کی رو سے مسلمہ اور متفقہ مستثنیات نہیں بدلے جا سکتے . بہر حال اس تعلیم میں (اگر انھوں نے واقعی یہ تعلیم دی ہو) مرزا قتیل یقیناً غلطی پر نہیں تھے - یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ انھوں نے یہ ہرگز نہ کہا ہوگا کہ "سہہ" کسی صورت سے واحد کے ساتھ ترکیب نہیں پاتا کیوں کہ خود انھوں نے متعدد جگہ اس طرح استعمال کیا ہے - پھر صرف کسی کے کہنے سننے پر یہ یقین کر لینا کہ قتیل نے سہہ عالم وغیرہ کی ترکیب غلط بتائی ہے - مرزا قتیل کو ہدف ملامت بنانا اور موقعہ بے موقعہ مذاق اڑانا کہاں تک درست ہے۔

اس کے علاوہ مرزا غالب کا یہ آزمودہ حربہ ہے کہ کسی ایسے ہی استشہار کرلے کر بے چارے قواعد دان و قواعد نگار کی ہنسی اڑا دیں سید عبدالواسع ہانسوی کو متعدد بار بے نقط سنائیں۔ فرماتے ہیں " وہ

---

[1] اس کا مطلق کوئی ثبوت نہیں کہ مرزا قتیل نے سہہ کے متعلق کچھ بھی کہا ہو - لیکن یہ مفروضہ ہم اس لئے زیر بحث لائے کہ جب اعتراض ہوا تھا تو لوگوں نے مرزا قتیل کا نام سند میں پیش کیا تھا - پھر مرزا غالب مدت تک مرزا قتیل کا مذاق اڑاتے رہے لیکن کسی نے یہ نہ کیا کہ یہ ثابت کر دے کہ مرزا قتیل پر یہ بہتان ہے۔

میاں صاحب ہانسی کے رہنے والے بہت چوڑے چکلے جناب عبدالواسع
کہتے ہیں کہ بے مراد صحیح اور نامراد غلط۔ ارے تیرا ستیاناس جائے۔
بے مراد اور نامراد میں وہ فرق ہے جو آسمان اور زمین میں ہے۔ نامراد وہ
ہے کہ جس کی کوئی مراد کوئی خواہش کوئی آرزو بر نہ آوے۔ بے مراد وہ
ہے کہ جس کا صفحۂ ضمیر نقوشِ مدعا سے سادہ ہو؟ حالانکہ جس چیز کو مرزا
نے اس بُری طرح سے لکھا ہے وہ علم صرف کا ایک نہایت مناسب
اور مستند قاعدہ ہے۔ مولوی عبدالباری صاحب آسی کا فیصلہ سنئیے۔
"ملائے ہانسوی کا مقصدِ کلام یہ ہے کہ نا اکثر مشتقات اور صفات
پر داخل ہوتا ہے جیسا کہ نابالغ اور ناسموع اور بے اسمائے غیر صفت پر
جیسا کہ بے دانش و بے علم و بے شعور و بے زر۔ لیکن حسب قول صاحب
فرہنگ انندراج بعض جگہ اس کے برعکس بھی پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ توان
اور امید کہ یہ دونوں لفظ غیر مشتق ہیں اور ان پر حرف نفی خلافِ قیاس
بجائے بے کے نا داخل ہوتا ہے۔ اور ناتوان اور ناامید کہا جاتا ہے۔
بے تواں اور بے امید مستعمل نہیں ہے۔ جیسا کہ سعدی نے کہا ہے۔
امید ہست پرستندگان مخلص را ؎ کہ ناامید نہ گردد ز آستانِ اِلٰہ
یا خواجہ حافظ ؎
ہان مشو ناامید چوں واقف نئی ز اسرارِ غیب ؎ باشد اندر پردہ بازیہائے پنہاں غم مخور
بعض جگہ ایسے مرکبات بھی نظر آئے کہ ایک ہی لفظ پر دونوں لفظ
داخل ہوئے ہیں۔ جیسا کہ بے سپاس اور ناسپاس وغیرہ وغیرہ۔
میرے خیال میں ملا عبدالواسع نے جو قاعدہ لکھا ہے وہ صحیح ضرور ہے

اس واسطے کہ قواعد کی اکثر کتابیں اسی کی تائید کرتی ہیں ۔ مگر انھوں نے چونکہ مستثنیات کا ذکر نہیں کیا اس لئے مرزا غالب کو اعتراض کا موقع مل گیا۔ ورنہ اصل میں خلاف قیاس اور شاذ کے طریق پر وہ الفاظ واقع ہوئے ہیں جنھیں مرزا نے اپنے واسطے دلیل قاطع سمجھا ہے ۔ اور اس قسم کے شاذ الفاظ کی علم صرف میں کوئی انتہا نہیں ۔ اس لحاظ سے ملا عبدالواسع پر یہ اعتراض واقع نہیں ہوتا اور چونکہ تمام متقدمین کا اس قاعدہ پر اجماع ہے اس لئے مرزا کی رائے اتنے لوگوں کے مقابلے میں نہیں مانی جا سکتی ۔ یہ اور بات ہے کہ بے مراد اور نامراد کے دو خاص معنی آپ کے ہاں ہو گئے ہیں مگر ان پر قاعدے کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی ۔[۱۹]

اس کے علاوہ خود غالب کے زمانے میں اور ان کے ہی دوستوں میں سے یعنی خواجہ غلام غوث بے خبر نے غالب کے اس دعوے اور اس منطق کے خلاف مولانا روم کی مثنوی میں سے تین شعر لکھ کر بھیجے تھے یعنی (۱)

عاقلان از بے مرادیہائے خویش ؎ با خبر گشتند از مولائے خویش

(۲) ع بے مرادی مومناں از نیک و بد

(۳) ع در ہلکی بے مرادت داشتے

اس پر غالب نے پہلے شعر کی تاویل کر دی لیکن دوسرے دو مصرعوں کے متعلق فرماتے ہیں :-

"ان دونوں مصرعوں میں نامراد اور بے مراد کے معنی میں خلط واقع

---

[۱۹] معرکۂ سخن صفحہ ۱۹۳

ہو گیا ہے۔ خیر بے مراد اور نامراد ایک سہی۔ ہرچند دوسرے مصرعہ بولوی میں بے مراد کے معنی بے حاجت کے درست ہوتے ہیں۔ مگر ع من کہ رندم شیوۂ من نیست بحث ٭ زیادہ تکرار کیا کروں۔ معہذا مصرعہ اول کی کوئی توجیہہ بھی نہیں کر سکتا" (بنام خواجہ غلام غوث)

(۷) مرزا قتیل نے جامہ گذاشتن کے استعمال میں بے وجہ احتیاط کی تلقین کی ہے۔ اگر اعتراضات نمبر ۲ و ۵ میں مرزا غالب نے اپنی "علمیت" کا ضرورت سے زیادہ اظہار کر دیا تھا تو اس اعتراض میں ان کی ذہنیت بالکل عریاں ہو گئی ہے۔ افسوس اور صد افسوس یہ ہے کہ اعتراض کو وقیع بنانے کے لئے انھوں نے غلط بیانی سے کام لیا ہے اور اس کے باوجود اعتراض اس قدر پوچ۔ لچر اور بے بنیاد کیا ہے کہ حد نہیں۔ مرزا غالب نے فرمایا ہے کہ قتیل نے کالپی کے نواب زادوں میں سے کسی ایک کو رقعہ لکھا تھا جو مرزا غالب نے بھی دیکھا۔ اس میں قتیل نے لکھا ہے کہ موقعہ دیکھ لیا کرو جب جامہ گذاشتن کو مردن کے معنی میں استعمال کیا کرو۔ افسوس اس بیان میں کوئی ایک بات بھی درست نہیں۔ جب پہلی بار انگلستان کی کرکٹ کی ایم۔ سی۔ سی کی ٹیم ہندوستان میں کرکٹ کھیلنے آئی تو یہاں کے اخباروں میں پہلے ہی سے اس ٹیم کے اور اس کے کھلاڑیوں کے حالات اور واقعات چھپنے شروع ہو گئے۔ اس ٹیم میں ایک مسٹر مرسر بھی تھے۔ ان کے متعلق ہندوستان کے اخبار نے تعارف کرتے ہوئے لکھا کہ "مسٹر مرسر پہلے بھی ہندوستان میں رہ چکے ہیں۔ وہ ایک رجمنٹ میں کپتان تھے۔ گیند پھینکنے میں ان کو کمال ہے اور وہ گیند الٹے ہاتھ سے پھینکتے ہیں۔" جب ٹیم ہندوستان

آن پہنچی تو کسی نے مسٹر مرسر کو یہ اخبار کی رپورٹ سنائی اور ان سے تصدیق
کا طالب ہوا۔ مسٹر مرسر نے فرمایا کہ "اس بیان کے متعلق مجھے صرف یہ
کہنا ہے کہ میں اب سے پہلے کبھی ہندوستان نہیں آیا۔ میں کسی بھی فوج
میں نوکر نہ تھا۔ نہ میں کبھی گیند پھینکتا ہوں نہ سیدھے ہاتھ سے نہ الٹے سے۔
اس کے علاوہ اخبار کا بیان حرف بحرف درست ہے"۔ بس یہی حال مرزا
غالب کے اس اعتراض کا ہے کہ مرزا قتیل کے جس رقعہ کا وہ حوالہ دیتے
ہیں وہ کالپی کے نواب زادے کو نہیں بلکہ خواجہ امامی کو لکھا گیا تھا۔ مرزا
غالب نے غالباً دیکھا نہیں تھا۔ اور نہ اس میں جامہ گذاشتن کے متعلق وہ
فضولیات ہے جس کا ذکر مرزا غالب نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ مرزا
کا اعتراض درست ہے۔

مذکورہ رقعہ مرزا قتیل کے مطبوعہ رقعات میں شامل ہے۔ یہ
رقعات عام طور پر غالب کے زمانے میں ملتے تھے۔ پھر انھوں نے کیوں
دانستہ یہ غلط بیانی فرمائی یہ سمجھ سے بالا ہے۔ اب آیئے رقعہ کی
اصل عبارت کو دیکھیں۔ کہ آخر مرزا قتیل نے کیا کہا ہے۔

"...... دیگر اینکہ در خط شما لفظ جامہ گذاشتن در حق شخصے بود۔
آیندہ مذکورِ او ہیچ نہ باید نوشت۔ خبرہائے اراجیف از زبانِ عوام معتبر نیست
اگر چیزے دلالت بر عظمت و جبروت او داشتہ باشد مضائقہ ندارد۔ والا
ہرچہ ضرور خصوصاً عبارتے کہ در او لفظ جامہ گذاشتن و مثل آن باشد ہیچ
صورت مناسب نیست۔ ہر چند ایں اصطلاح را کم کسے می داند لیکن بقرینہ
دریافت می تواند شد۔ آیندہ اگر ہیچ چیزے بگوش خورد بہتر انیست کہ ننویسد۔

چراکہ اگر اصلے دارد بعد دو روز شاہم خواہید شنید و اگر دروغ است نوشتن آن خالی از قباحت نیست وایں ہمہ آفت ہا در تصریح نام شخص است ۔ اگر بکنایہ باشد ہیچ قباحتے نہ دارد .... یا تمام عبارت در ترکی نوشتن بہتر است کہ احدے بر آن مطلع نمی شود[۹۵]

اے لیجئے یہ تھا سارا معاملہ ۔ خواجہ امامی نے مرزا قتیل کو کہیں لکھ دیا کہ سنا ہے .... انتقال کر گئے ۔ یہ صاحب دربار میں کچھ درجہ رکھتے تھے قتیل نے خواجہ امامی کو جواب میں لکھا کہ اہم آدمیوں کے متعلق محض سنی سنائی باتوں پر بھروسہ کر کے اس طرح نہ لکھ دینا چاہئیے ۔ اگر کچھ تعریف و توصیف کی بات ہوتی تو ہرج نہ تھا لیکن یہ وفات کی بات اگر غلط نکلے تو قباحت ہوگی ۔ یا تو ایسی باتوں کو لکھو ہی نہیں یا نام لے کر نہ لکھو کنایتہً لکھو، اور یا پھر ترکی میں لکھو کہ کوئی سمجھے ہی نہیں ۔ اس سب کا مرزا غالب یہ مطلب سمجھے کہ مرزا قتیل وفات کے لئے جامہ گذاشتن کے محاورہ کا استعمال صحیح نہیں سمجھتے تھے ۔ وائے بریں عقل یہ کسی طرح یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ مرزا غالب نے رقعہ پڑھ کر اس کا مطلب نہ سمجھا ہو ۔ پھر یا تو انھوں نے دانستہ غلط معنی پہنا کر اعتراض وارد کیا ہے ۔ اور یا پھر شاید انھوں نے یہ رقعہ خود دیکھا ہی نہیں ۔ محض سُنی سنائی باتوں پر یقین کر بیٹھے ۔ اور کیونکہ یہ ایک صورت تھی مرزا قتیل کے خلاف نیش زنی کی اس لئے بلا تحقیق اس کو لے اڑے بلکہ اس کو وزنی بنانے کے خیال سے یہ بھی کہہ دیا کہ میں نے رقعہ

---

۹۵ رقعہ ۷۱ ، مطبوعہ رقعات قتیل

دیکھا ہے۔ اس کے متعلق اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اگر سماعی بات پر یقین کر کے مرزا کا اعتراض کو شنا نہایت نامستحسن اور قبیح فعل ہے تو خود پڑھ کر اور اس کو دانستہ غلط معنی پہنا کر اعتراض کرنا قبیح تر ہے۔

مرزا قتیل اودھ دربار میں تھے۔ ہندوستان کے درباروں کی روز مرہ کی سازشیں اور پوشیدہ چالیں ہر وقت ان کے پیش نظر تھیں۔ شخصی حکومت میں افراد کی جو اہمیت ہوتی ہے اس سے وہ ناواقف نہ تھے۔ اسی لئے وہ اپنے دوستوں اور شاگردوں کو اکثر لکھتے رہتے تھے کہ دربار کے معاملات میں دخل دینے یا ان پر رائے زنی کرنے میں بے حد احتیاط سے کام لیں۔ اس کی متعدد مثالیں خود رقعات قتیل میں ہیں۔ رقعہ نمبر ۱۹ میں کہتے ہیں:-

"سطرے متضمن مذمت ہرکارہائے ڈاک در علائے بود در حق شان بود۔ آئندہ ازان اجتناب ضرورت است۔ گاہ ہست کہ خط بدست کسے بیفتد۔"

رقعہ ۱۲۸ میں فرماتے ہیں:-

"وانچہ شما در حق خیرات علی عرض کردہ بودید کہ بعد وفات نواب آصف الدولہ امیر الدولہ مرحوم خواست کہ الکا ملازم خود سازد قبول نکرد منجبات آن بخیال نرسیدہ باشد۔ ظاہر است کہ امیر الدولہ ہشت سال پیش از آصف الدولہ قضا کردہ بود۔ شاید غرض شما از امیر الدولہ حسن رضا خاں بودہ باشد۔ بدانید کہ امیر الدولہ خطاب حیدر بیگ خاں بود و حسن رضا خاں را سرفراز الدولہ می گفتند۔ و مخالفاں بریں قول اعتراض می کنند گویندہ را متہم بکذب می سازند۔ آئندہ

اند کے تحقیق نمودہ حرف باید زد۔ ومقدمات دربار بسیار نازک می باشد
اگرچہ شما ہنوز طفل اند احوال امرائے لکھنؤ چہ می دانید و چہ ضرور کہ ایں چیزہا را
تحقیق بکنید لیکن در دربار آنچہ معلوم باشد باید گفت"

جس کو نواب سعادت علی خاں کے زمانے کے لکھنؤ کی تاریخ اور
ان کے انتظام سلطنت سے تھوڑی بھی واقفیت ہے وہ اس "احتیاط"
کی اہمیت فوراً سمجھ لے گا۔ نواب موصوف کی سلطنت کا دار ومدار ہی
دارالاخبار پر تھا اور جاسوسوں اور پرچہ نویسوں کی وہ بن آئی تھی کہ بڑے
سے بڑا امیر بھی ان کے رحم و کرم پر تھا۔[1]

(۸) مرزا قتیل نے اردو کا محاورہ فارسی میں باندھا ہے۔
"ہیچ نہ بود" کی جگہ "خاک نہ بود" لکھ گئے اس کے متعلق ہم چاہتے ہیں
کہ شروع ہی میں یہ اعتراف کرلیا جائے کہ مرزا غالب کا یہ اعتراض
بالکل ٹھیک ہے۔ اور "خاک نہ بود" بجائے "ہیچ نہ بود" یقیناً غلط
فارسی ہے۔

یوں تو اس اقرار کے بعد اب کسی مزید بحث کی گنجائش نہیں
رہتی لیکن حسب ذیل چند معروضات پیش ناظرین کی جاتی ہیں ممکن ہے
ان کے مطالعہ کے بعد تعزیر میں نرمی کا امکان ہوسکے۔

پہلے تو شعر ہی کو ملاحظہ فرمائیے ؏
یک وجب جائے بکمے تو زخون پاک بود ؎ کشتہ برکشتہ تپاں بود گر خاک نہ بود

---

[1] تاریخ اودھ از مولوی نجم الغنی صاحب رامپوری۔ جلد چہارم صفحہ ۲۷

'خاک نہ بود' میں ایہام کا پہلو نکلتا ہے۔ کیونکہ یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ تیرے کوچے میں بسمل لاشوں کے تودے کے تودے ہیں اور اس قدر ہیں کہ زمین دکھائی نہیں دیتی۔ غالباً یہی ایہام کا لالچ تھا کہ مرزا قتیل غلط محاورہ باندھ گئے [1] ورنہ مرزا ہیچ اور خاک کا فرق خوب جانتے تھے۔ جیسا کہ انھوں نے نہر الفصاحت صفحہ ۲۷ پر بیان کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ مرزا قتیل عام اہلِ ہند اور اہلِ ایران کی فارسی کے سارے اختلافات کماحقہٗ جانتے تھے۔ نہر الفصاحت صفحہ ۴۶ پر ہر دو طرز تحریر کے مفصل نمونے دئے ہیں

---

[1] ایہام کا یہ لالچ اور اس کی اس قدر قدر کچھ مرزا قتیل پر ہی موقوف نہیں۔ وہ زمانہ ہی ایسا تھا بلکہ سچ پوچھئے تو دیوانِ قتیل میں اس قدر کم یہ سستی صنعت پائی جاتی ہے کہ تعجب ہوتا کہ اس ماحول میں رہتے ہوئے مرزا قتیل کیونکر اس دلدل سے اتنے بچے رہے۔ اس عام روش کا اس سے اندازہ لگائیے کہ مرزا قتیل کے دیوان میں کم و بیش سات ہزار اشعار ہیں۔ لیکن اکثر تذکرہ نویسوں نے (جن میں بڑے بڑے صاحب ذوق بھی ہیں) قتیل کے اشعار میں سے یہ شعر "خاک نہ بود" والا بالالتزام انتخاب کر کے اپنے تذکرے میں لکھا ہے۔ مثلاً تذکرۂ مخزن الغرائب از احمد علی ہاشمی (قلمی) تذکرہ شمع انجمن از نواب صدیق حسن خاں۔ تذکرہ نتائج الافکار از محمد قدرت اللہ (قلمی) وغیرہ وغیرہ
مرزا غالب بھی اس سے بچے ہوئے نہیں تھے۔ بلکہ ان کے اشعار بھی بعض دفعہ اسی لالچ میں بے معنی ہو جاتے تھے۔ مثلاً ؎

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

چار شربت صفحہ ۲۵ پر ہندوستانیوں کی فارسی کے اوپر سیر حاصل بحث کی ہے اور ان کی غلطیاں اور کمزوریاں ظاہر کی ہیں۔ ان سب حوالہ جات کو مفصل بیان کرنا یقیناً تطویل لاطائل کے مترادف ہوگا۔ اہل ذوق ان مقامات کو خود دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن ان کا ذکر محض اس لئے کیا گیا کہ "ہندی فارسی نویس" کی پھبتی کسی طرح مرزا قتیل پر عاید نہیں ہوتی باوجودیکہ ان سے ایک جگہ محاورے کی غلطی ہو گئی ہے۔

اب آئیے یہ بھی دیکھیں کہ کس درجے کی غلطی ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ ہندی محاورے کا ترجمہ اور استعمال فارسی میں جائز نہیں۔ اور گو یہ مخصوص محاورہ ایسا ہے کہ اس میں فارسی لفظ استعمال کیا گیا ہے (خاک) لیکن چونکہ اردو میں اس ترکیب کے معنی فارسی سے جدا لئے جاتے ہیں اسلئے ہندوستانی معنوں میں اس کا استعمال فارسی میں جائز نہیں کیونکہ فارسی میں ان معنوں میں کسی استاد نے نہیں لکھا۔ جیسا عرض کیا جا چکا ہے یہ قاعدہ بالکل درست لیکن شاید اس کی سختی کچھ کم ہو جائے اگر ناظرین یہ یاد فرمائیں کہ یہ بدعت قتیل سے پہلے (اور بعد میں بھی) اکثر ہوتی رہی ہے۔ اور ان لوگوں سے سرزد ہوئی جن کو مرزا غالب جیسا سخت گیر نقاد استادی کا درجہ دے چکا ہے۔ مرزا قتیل نے نہر الفصاحت کے صفحہ ۲ پر ایک بحث شروع کی ہے۔ "باید دانست کہ عوام ہند کہ خبر از فارسی نہ دارند لفظے چند استعمال کنند در مجمع اہل زبان موجب ریشخند باشد" اور اس کے بعد ایسے الفاظ اور ترکیبوں کی ایک مفصل فہرست دی ہے جو تین صفحوں پر بسیط ہے۔ اس کے بعد ایسے الفاظ دیے ہیں جو گو محاورۂ اہل ہند ہیں لیکن ایرانی شعرا نے

استعمال کئے ہیں۔ مثلاً روزگار بمعنی نوکری۔ اشرف مازندرانی کہتا ہے:۔

ع بہند زلف او بے روزگار است

یا آبگینہ بمعنی آئینہ۔ مرزا صاحب نے کہا ہے ؎

گناہ زشتیٔ خود را بآبگینہ منہ ٭ مکن چو سنگدلاں شکوہ از زمانۂ خویش

یا بادفروش بمعنی بھاٹ ابوالنصر بدخشانی نے جو کبھی ہندوستان نہیں آیا باندھا ہے ؎

بسان بادفروشاں چہ بادہ پیمائی ٭ کہ در شرافت خود از گروہ براری

خسرو علیہ الرحمۃ نے ہندی محاورہ "تیری گرہ سے کیا گیا" اس طرح باندھا ہے ؎

اوی رود بناز وگرہ می زند بہ زلف ٭ مُردن مراست از گرہِ او چہ می رود

اس کے علاوہ خود مرزا غالب نے ہندی محاورہ فارسی میں استعمال کیا ہے اور میری گرہ سے کیا گیا کو اس طرح ترجمہ فرمایا ہے ؎

گوئی مباد در شکنِ طرہ خوں شود ٭ دل زانِ تست از گرۂ ما چہ می رود

"لفظ 'بے پیر' تورانی بچہ اے ہندی نژاد کا تراشا ہوا ہے مرزا جلال اسیر علیہ الرحمۃ مختار ہیں۔ اور ان کا کلام سند ہے۔ میری کیا مجال کہ ان کے باندھے ہوئے لفظ کو غلط کہوں۔ لیکن تعجب ہے اور بہت تعجب ہے کہ امیرزادۂ ایران ایسا لفظ لکھے[1]۔"

---

[1] جلال اسیر پر مرزا غالب صرف تعجب کر کے رہ گئے اور غلط کہنے کی بھی مجال نہ ہوئی۔ لیکن بے چارے قتیل کو ایسی ہی غلطی پر سب کچھ کہہ ڈالا۔ اس موقعہ پر خود مرزا غالب کا ایک لطیفہ یاد آتا ہے۔ ان کا ایک شعر ہے ؎ (باقی صفحہ ۱۰۹ پر)

ایسی مثالیں اور بھی بہت دی جاسکتی ہیں۔ لیکن اتنی ہی مثالوں سے یہ تو واضح ہوگیا ہوگا کہ فارسی میں ہندی محاورے کا استعمال نہ اتنی زبردست بدعت ہے کہ کسی اور سے سرزد نہ ہوئی ہو نہ ایسا جرم کہ اس کا مرتکب گردن زدنی ٹھیرے۔

غلطی سے تو غالب بھی بچے ہوئے نہیں ہیں

ان تفصیلات کے بعد ایک چیز جو بالکل صاف ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ مرزا غالب نے غالباً مرزا قتیل کی تصانیف کو دیکھے بغیر ان پر اعتراضات کر دئے۔ اور پھر اس میں حق و صداقت، ادب و قاعدہ تمیز اور تہذیب کا لحاظ تو الگ رہا صریح اور بین غلط بیانیوں اور دروغ بافیوں سے کام لیا اور بے وجہ اور بے دلیل قتیل کو ہدفِ ملامت بنایا۔ ایک کے سوا باقی کے سب اعتراضات بلا کسی اصل کے ہیں۔ اس ایک اعتراض میں بھی مرزا غالب نے سوئی کو بھالا اور رائی کو پہاڑ بنا کر بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ بہر حال اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ واقعی خاک نبود' میں قتیل سے ناقابلِ عفو غلطی ہوئی ہے تب بھی یہ ایسی چیز نہیں جس کی وجہ سے کسی کی ساری لیاقت پر پانی پھر جائے۔ غلطی سے کون بچا ہے۔ جید سے جید عالم اور بڑے سے بڑے شاعر کی غلطیاں ظاہر کی

بوڑھے کہ دراں خضر با عصا خفتست ؛ بسبزی سپرم راہ گرچہ پا خفتست

اسپر عصا خفتست" پر اعتراض ہوا تو مرزا غالب نے شیخ سعدی کے مطائیبات میں سے ایک مصرع پڑھا ع وسلمہ جلا اول عصائے شیخ بخفت ، اور کہا کہ میں چونکہ ہندی نژاد ہوں تو مجھ پر اعتراض ہوتا ہے۔ چچا سعدی کا عصا کوئی نہیں پکڑتا۔

جاچکی ہیں۔ خود غالب کہاں کے ایسے دودھ کے دھوئے تھے۔ فارسی کو فی الحال چھوڑیئے کہ اس کی اصل جانچ اہلِ زبان ہی کر سکتا ہے۔ ان کے اُردو کلام میں جس کی وجہ سے مرزا غالب غالب بنے بہت سی غلطیاں پکڑی گئی ہیں۔ میرا مطلب حرف گیری اور نکتہ چینی نہیں۔ بلکہ محض یہ ظاہر کرنا ہے کہ خطا اور سہو سے تو غالب بھی مبرا نہیں۔ ذیل میں غالب کی چند ایک صرف ایسی لغزشیں بیان کی جاتی ہیں جو غالب کے کسی اور معترض کے ہاں میری نظر سے نہیں گذریں :-

شترگربہ :-

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا ؛ آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا
وعدہ آنے کا وفا کیجئے یہ کیا انداز ہے ؛ تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے
بوسہ نہیں، نہ دیجئے دشنام ہی سہی ؛ آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

نامکمل فقرہ :-

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ؛ ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

مصرعہ ثانی یوں ہوا ۔ "ہم کو منصور کی تنک ظرفی کی تقلید نہیں"؛ کہا نہیں ؟ - کہنا چاہتے تھے کہ تقلید پسند یا منظور نہیں لیکن یہ مصرع میں نہ آسکا۔ یہ مستحسن مقدرات میں سے نہیں گنا جا سکتا۔

نامکمل مضمون :- غالب کے دیوان میں ایک چار شعر کی غزل ہے "جگر کو دیکھتے ہیں"۔ "گھر کو دیکھتے ہیں" اور جس کا ایک بے مثل شعر ہے ؎
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے ؛ کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
اس غزل کا مطلع ہے ؎

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں ؎ کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

اس مصرعہ اولیٰ میں حرف شرط کا کیا موقعہ ہے۔ یہ شعر کسی اور شعر سے ربط نہیں کھاتا۔ مضمون ادھورا رہ گیا۔

تحریف فی محاورہ :

ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر ؎ خاک میں عشاق کے غبار نہیں ہے

یہاں یہ مطلب لیا ہے کہ معشوق کو ہم سے ناحق رنجش ہے کیونکہ ہم عاشقوں کے خمیر یا سرشت ہی میں غبار نہیں ہے[1] لیکن مرزا غالب یہاں خاک کا لفظ غلط استعمال کر گئے۔ اُردو میں ایسی جگہ خمیر یا سرشت کی جگہ مٹی کہتے ہیں نہ کہ خاک۔ زندگی کی حالت میں مٹی اور مرنے کے بعد خاک کہتے ہیں" بڑی بے وفا مٹی ہے آپ کی۔ کبھی پوچھتے بھی نہیں" یا جس شخص کے بہت پھوڑے پھنسی نکلتے ہیں اس کے لئے کہتے ہیں کہ "بہت نکمی مٹی ہے"۔ یا مثلاً کوئی کسی دور دراز سفر پر جائے اور دوست احباب منع کریں اور کہیں کہ وہاں مرنہ جاؤ۔ تو کہا جاتا ہے "جہاں کی مٹی ہے وہیں موت آئے گی اس کا کیا تکرار" غرضیکہ زندگی کی حالت میں ان معنوں میں کسی جگہ بھی خاک نہیں بولتے۔ ہاں مرنے کے بعد خاک کہتے ہیں۔ میر محمد علی بیدار کا شعر غالب سے پہلے کا کہا ہوا ہے ؎

ہم خاک بھی ہو گئے و لیکن ؎ جی سے نہ ترے غبار نکلا

---

[1] اس کے علاوہ یوں بھی "خاک میں غبار ہونا یا نہ ہونا" بالکل خلاف محاورہ ہے۔ دل میں غبار ہونا کہتے ہیں۔

غالب کا شعر زندگی کی حالت کے متعلق ہے اس لئے مٹی کے بجائے خاک کا استعمال غلط ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ مرزا قتیل کے ہاں فارسی میں اسی خاک کے لفظ پر مرزا غالب نے اعتراض کیا تھا جسے اردو میں خود غلط استعمال کر بیٹھے۔

غلط محاورہ :- اردو کا محاورہ ہے کِھلنا بالکسر اول بمعنی بہار دینا جچنا۔ مناسب اور بھلا معلوم دینا۔ جیسے "یہ اچکن آپ پر بہت کِھلتی ہے"۔ غالب نے کُھلنا بالضم اسی معنی میں باندھا ہے۔ ع صبح دم دروازۂ خاور کھلا' کی زمین میں فرمایا ہے ؎

تاج زریں مہر تاباں سے سوا ۔۔ خسرو آفاق کے منہ پر کھلا
واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ ۔۔ زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا

یا ع ۔ دیکھیو یارب یہ در گنجینۂ گوہر کھلا' کی زمین میں کہا ہے ؎

زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

خلاف واقعہ یا خلاف ارادہ باتوں کا اظہار :- ؎

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو ۔۔ نہ ہوئی غالب اگر عمر طبیعی نہ سہی

اس شعر سے تو یہ نکلتا ہے گویا عمرِ طبعی عشرتِ صحبتِ خوباں سے بہتر چیز ہے۔ لیکن خیر اگر وہ نہیں تو یہی سہی ع گندم اگر بہم نہ رسد بھس غنیمت است۔ حالانکہ ارادتاً تو شاید غالب نے بھی یہ بات نہ کہنی چاہی ہو۔ "غنیمت سمجھو" کی جگہ اگر "کو حاصل سمجھو" ہوتا تو خاصی بات بن جاتی۔

حشو و زوائد ۔ عجز گوئی ؎

قرض کی پیتے تھے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں ۔۔ رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

اس لب سے مل ہی جائیگا بوسہ کبھی تو ہاں ؛ شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیے

یہ "ہاں" اور "کبھی تو ہاں" کی الاپ محض تال پوری کرنے کے لئے

نہیں تو اور کیا ہے۔

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں ؛ ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

یہاں "کچھ نہ کیا" "آنہ سکا" "کچھ نہ کی" باندھ دیا۔

غیر فصیح الفاظ کا استعمال ، الفاظ کی مناسبت شاعری کی جان ہے۔
ایک جگہ ایک ہی قسم کے الفاظ سے جو توازن اور تناسب کلام میں پیدا ہو جاتا ہے وہی اصل فصاحت ہے۔ اس کی مثال میں شبنم کے متعلق یہ دو مصرعے اکثر پیش کئے جاتے ہیں :-

ع کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا

ع شبنم نے بھر دئیے تھے کٹورے گلاب کے

پہلے مصرعے میں ہندی لفظوں کی سنگت ہے ۔ دوسرے میں شبنم اور گلاب کا اتصال ۔ اگر اس مصرعے میں شبنم اور اُس میں اوس ہو تو فصاحت کا خون ہو جائے ۔ اب غالب کے دو ایک شعر سنئے ؎

توسنِ شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب ؛ تھان سے یہ غیرتِ صرصر کھلا

توسن شہ ، غیرتِ صرصر اور ....تھان !

پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ

پہلے ٹھونکی ہے بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ ڈالی ہے ! اور بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل ٹھونکی ہے !!

بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے

بھوں پا اور بھوں پُو میں تھوڑا ہی فرق ہے۔

الفاظ سوقیانہ کا استعمال :-

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی ؎ سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

ع غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا ؎ عشقِ نبرد پیشہ طلب گارِ مرد تھا

وصول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں ؎ ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

غم زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی ؎ وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

معنی میں ابتذال :-

مزا ملے کہو کیا خاک ساتھ سونے کا ؎ رکھے جو بیچ میں وہ شوخ سیم تن تکیہ

کافی ہے نشانی ترے چھلّے کا نہ دینا ؎ خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر وقت نگاہ ؎ جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

کم درجے کی اور سستی مراعات النظیر۔ ایہام۔ رعایت الفاظ جس سے اکثر شعر بے معنی ہو گیا :-

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے ؎ کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

یہاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں ؎ زلف گر بن جاؤں تو شانے میں الجھائے مجھے

منہ نہ دکھلاوے نہ دکھلا پر بہ اندازِ عتاب ؎ کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخن گرم ؎ تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

خطِ عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد ؎ یک قلم منظور ہے جو کچھ کہ ارزانی کرے

کہاں تک روؤں اس کے خیمہ کے پیچھے قیامت ہے ؎ مری قسمت میں یا رب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا ؎ جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر ؎ مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی ؎ سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

کیوں بوتے ہیں باغباں تونبے ؎ گر باغ گدائے مے نہیں ہے

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے ؎ ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے یہ چند اشعار ایسے یہاں درج کئے گئے ہیں جو کسی اور معترض کے ہاں میں نے نہیں دیکھے ۔ ان کے علاوہ ان کے بے شمار ایسے اشعار ہیں جو نہ اردو کے ہیں نہ فارسی کے اور گو توجیہ اور تاویل کرنے کو کر لی جائے لیکن اکثر ان میں سے بالکل بے معنی ہیں[1] ایسے ہی

---

[1] فریدآباد میں ایک دفعہ ایک مشاعرہ ہوا۔ طرح تھی 'جائے تو اچھا' 'لائے تو اچھا' ایک بزرگ ماسٹر رتی رام صاحب نے بھی غزل پڑھی ۔ عجیب عجیب شعر نکالے تھے مثلاً ان میں سے ایک یہ تھا ؎

یہ دست دہائے خوش اسی مل جائے تو اچھا ؎ دل بند حنا بند گھڑی ہاتھ مل رہی

حسن اتفاق سے خاتم داستان گویان ہند ۔ یکتائے زمانہ میر باقر علی داستان گو دہلوی شریک مجلس تھے ۔ انھوں نے اس قدر برجستہ اور عمدہ معنی اس شعر کے بتائے کہ محفل حیران رہ گئی ۔ یہ اور بات ہے کہ بعد میں تخلیہ میں میر صاحب مرحوم اور ہم گھنٹوں ماسٹر صاحب کی لاجواب غزل پر "سر دھنتے" رہے خصوصاً جب میر صاحب مرحوم نے اپنے مخصوص انداز میں "بھائی رتی کا منہ کالا" کہہ کر محفل برخاست کرنی چاہی۔

سینکڑوں جگہ انھوں نے فارسی محاورے کو ترجمہ کرکے اُردو میں استعمال کیا ہے۔ گو اردو میں اس کے معنی بالکل جدا ہیں مثلاً دیکھنے کے لئے تماشا کرنا یا ہونے کے بجائے آنا مثلاً سہ

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا ٭ دل جگر تشنۂ فریاد آیا

ایسے اور دیگر قواعد و معانی کے نقطہ ہائے نظر سے غالب پر مولانا نظم طباطبائی، یاس یگانہ۔ آرگس اور دیگر اصحاب نے بہت سے اعتراضات کئے ہیں۔ تذکرۂ معرکۂ سخن از مولانا عبدالباری آسی میں بھی پچیس تیس صفحوں میں غالب پر کئے ہوئے اعتراضات جمع کرکے درج کئے گئے ہیں۔

ان کے علاوہ بھی مرزا کی کئی ایک غلطیاں ایسی تھیں جو ان کی زندگی ہی میں ان کو بتلادی گئی تھیں اور جن کی انھوں نے اصلاح کرلی[91] قاطع برہان تردیدی بیان تھا۔ یہ اور اس سلسلے کی دوسری کتابیں دوسروں کی لکھی ہوئی لغت کی غلطیاں نکالنے کے لئے لکھی گئی تھیں خود غالب کو بھی اعتراف ہے کہ یہ بہت احتیاط اور کاوش سے لکھی گئی تھیں[92] لیکن اس تمام کوشش کے باوجود بھی وہ آویزہ اور افسوس کے بارے میں دھوکا کھا گئے[93] اور انہی فارسی نویسان ہند کی نکتہ چینی پر اس کی اصلاح کی۔ اس سے ان کو اندازہ ہونا چاہیئے تھا کہ فرہنگ لکھنا کتنا مشکل کام ہے۔ اور اس میں غلطیاں رہ جاتی

---

91. یادگار غالب صفحہ ۶۵، غالب از مہر صفحہ ۲۷۰ تا ۲۷۲

92. ادبی خطوط غالب صفحہ ۱۹

93. " " " ۱۱۶

کتنا آسان ہے۔ دستنبو بڑے دعووں اور تیاریوں کے ساتھ لکھی کہ فارسی کے علاوہ اور کوئی لغت نہ آئے گا۔ پھر بھی عربی کا ایک لفظ استعمال کر گئے اور اس کو بعد میں نکلوا یا۔ بعض جگہ بتلائے پر بھی نہ مانے۔ مثلاً فراز کہ اگرچہ دراصل لغتِ اضداد میں سے ہے لیکن وہ اس پر اڑے رہے کہ اس کے معنی صرف "بند" کے ہیں۔[1] یا مثلاً ان کے ایک مطلع سے

از جسم بجاں نقاب تا کے ؛ ایں گنج دریں خراب تا کے

پر ایک عالم خراسانی عارف علی شاہ خراسانی نے تین اعتراض کئے " پہلا نقاب کے ساتھ عارض، و رخ کا ذکر بھی ضرور تھا وہ نہیں۔ دوسرا گنج تو ویرانے ہی میں ہوتا ہے پھر اس پر تاسف کیا جو کہتے ہو "تا کے"۔ تیسرا ویرانہ کو خرابہ کہتے ہیں نہ خراب۔ اور ان اعتراضوں کے بعد انھوں نے دخل کیا تھا[2]

از جسم بجان حجاب تا کے ؛ گل بر رخ آفتاب تا کے[2]

یہ اعتراض اور اصلاح غالب نے نہ مانی۔ خراب بمعنی خرابہ کے لئے صائب کا ایک شعر سند میں پیش کیا۔ لیکن یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ اعتراض بھی ایک اہلِ زبان نے کیا تھا اس لئے صرف ایک سند سے کام نہیں چل سکتا۔ خواہ وہ اہلِ زبان کی ہی کیوں نہ ہو۔ پھر مرزا صائب کے متعلق تو خود غالب کا قول ہے کہ وہ غلط بندشیں بھی باندھ جاتے تھے۔ فرماتے ہیں:۔
"صائب اگرچہ اصفہانی نژاد تھا لیکن واردِ شاہجہان آباد تھا۔

---

[1] ادبی خطوط غالب صفحہ ۲۰۲
[2] " " " " ۱۰۲

انتظام کشیدن اور انتقام گرفتن دونوں بول گیا[۵۱]۔ حجاب اور نقاب اور گنج دویرانہ میں بھی مرزا غالب نے بہت سی تاویلیں کی لیکن کوئی سند نہیں دی۔

اسی طرح اُردو میں آردو کو مذکر لکھا ہے[۵۲]۔ غور کو مونث[۵۳] چابی کو انگریزی لغت بتایا ہے[۵۴]۔ بہر حال مطلب یہ ہے کہ غلطیاں سب سے ہو ہی جاتی ہیں۔ غالب کے اں بھی ان کی کمی نہیں۔ کچھ ان کی زندگی میں دوسروں کے بتانے سے درست کرلی گئیں۔ کچھ اب بھی موجود ہیں۔ لیکن ان کی وجہ سے غالب کے کمال شاعری پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اسی طرح قتیل کی صرف ایک غلطی کو ناقابل عفو نہیں کہا جا سکتا۔ کیا عجب ہے کہ اگر وہ نظر ثانی کرتے تو خود اس کو درست کر لیتے۔ مرزا قتیل کسی مسودہ پر نظر ثانی نہیں کیا کرتے تھے۔ وہ اس محنت کو ناقابل برداشت سمجھتے تھے[۵۵]۔

اس قضیہ کی اصل | اصل میں یہ معاملہ صرف چند اعتراضات اور جوابات کا نہیں ہے اس سارے جھگڑے کی جڑ یہ ہے کہ مرزا غالب کے نزدیک خود ان کے اور امیر خسروؒ کے علاوہ اور کوئی ہندوستانی صحیح فارسی جاننے کا

---

۵۱ ادبی خطوط غالب صفحہ ۸۶

۵۲ " " " " ۴

۵۳ " " " " ۱۴۴

۵۴ " " " " ۲۰۹

۵۵ رقعات قتیل " ۳۲

اہل ہی نہیں۔ گو خود ہندی نژاد تھے ۔ نہ کسی عجمی سے صحبت ہی رہی تھی[91] اور نہ
اس زمانے میں ہندوستان میں فارسی کا کچھ زیادہ چرچا ہی رہ گیا تھا۔ انیسویں
صدی کے ربع اول تک سرکاری زبان ہی فارسی نہ تھی[92] بلکہ شرفا کے گھر کی
زبان بھی فارسی تھی ۔ پھر چونکہ ہندوستانی سیاست بھی ابھی بالکل مردہ نہیں
ہوگئی تھی اس لئے ایرانی شعراء اور اہل علم کا بھی تانتا لگا رہتا تھا ۔ وفاقمی ۔
متین ۔ ہاتف ۔ موالی ۔ گرامی ۔ فروغ ۔ فدائی ۔ حشمت ۔ والہ داغستانی ۔
علی حزیں وغیرہ وغیرہ اٹھارویں صدی کے ختم کے قریب تک ہی ہندوستان میں
آئے ۔ دربار داری کے علاوہ بھی اس قدر ایرانی تلاش معاش آتے تھے
کہ عام طور پر فارسی انہی لوگوں سے پڑھی جاتی تھی ایران اور ہندوستان میں
رشتہ داری اور شادی بیاہ کے تعلقات بھی قائم تھے ۔ لیکن غالب کے
زمانے میں یہ سب بدل چکا تھا ۔ اور ذوق اور ظفر کی وجہ سے ادبی حلقے سے
بھی فارسی نکالی جا چکی تھی ۔ گویا ہندوستان میں رہ کر فارسی کو کماحقہٗ حاصل
کرنے کے بہت کم مواقع رہ گئے تھے ۔ لیکن مرزا غالب کہتے تھے کہ ان کا
فارسی ذوق اور علم زباں دانی الہامی اور وجدانی ہے ۔ اور براہ راست مبداء فیض
سے عطا ہوا ہے ۔" اس زبان کے قواعد و ضوابط میری ضمیر میں اس طرح
جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر[93]" ایک اور جگہ فرمایا ہے کہ" زبان دانی فارسی

---

۹۱ ہرمز کی شاگردی سے بھی انکاری تھے ۔ یادگار غالب صفحہ ۱۱

۹۲ ۱۸۳۵ء تک سرکاری زبان فارسی تھی لیکن اصلیت میں فارسی اٹھارویں صدی کے ساتھ ہی ختم ہو چکی تھی۔

۹۳ ادبی خطوط غالب صفحہ ۱۵۲

میرزا ازلی دستگاہ ہے اور یہ عطیہ خاص من جانب اللہ ہے[51]" اور سب کی فارسی کیونکہ اکتسابی تھی اس لئے ناقص۔ یہ ہیں اصل میں ان کے اعتقادات اور دعاوی۔ باقی ہندوستانی فارسی دانوں پر طعن و تشنیع اور سب و شتم تو گویا انہی مفروضات کا لازمی شاخسانہ تھا۔ اب آئیے ان کی اس منطق اور ان دونوں دعوؤں کا بھی تجزیہ کریں۔

کیا مرزا غالب کا علم فارسی الہامی تھا

ایک صورت تو اس دعوے کے جانچنے کی یہ ہے کہ مرزا غالب کی تعلیم و تعلم کا ذکر کیا جائے۔ جس نے مرزا غالب کو فارسی سکھائی۔ ملا عبدالصمد ہرمز کو اگر نظر انداز بھی کر دیا جائے تو بھی مولوی معظم کی شاگردی سے تو انکار نہیں۔ اس کے علاوہ دلی میں آنے کے بعد انہوں نے فارسی شعراء کا غائر مطالعہ کیا۔ اور یہی وجہ تھی کہ مرزا کے کلام کی روایات کا سلسلہ حزیں بیدل ظہوری عرفی نظیری کے واسطے سے امیر خسرو تک پہنچتا تھا۔ اور ان کے کلام میں انہی شعراء کی خصوصیات آگئیں[52]۔ دلی میں خوش قسمتی سے ان کو ایسے باکمال لوگوں کی صحبت میسر آئی کہ طبیعت میں اور جلا پیدا ہو گئی۔ قدماء کے کلام سے فیض یاب ہونے اور انہی کے طفیل کچھ حاصل کر سکنے سے سنجیدہ لمحوں میں ان کو خود بھی انکار نہ تھا۔ ؎

دامن از کف کنم چگونہ رہا ؎ طالب و عرفی و نظیری را
خاصہ روح روانِ معنی را ؎ آن ظہوری جہان معنی را

---

۵۱ ادبی خطوط غالب صفحہ ۱۱۴

۵۲ غالب نامہ " ۲۹

اس کے علاوہ نثر میں بھی اپنے خطوط میں متعدد بار اساتذۂ سلف کے کلام سے اکتساب فیض کا اقرار کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"غالب کہتا ہے کہ اساتذہ کے کلام کے مشاہدے میں اگر توغل رہے تو ہزار ہا بات نئی معلوم ہوتی ہے[51]"

پھر فرمایا :-

"جب رودکی و عنصری و خاقانی و رشید وطواط و ان کے امثال و نظائر کا کلام بالاستیعاب دیکھا جائے اور ان ترکیبوں سے آشنائی بہم پہنچائی جائے اور ذہن اعوجاج کی طرف نہ لے جائے تب آدمی جانتا ہے کہ ہاں فارسی یہ ہے[52]"

غرضکہ یہ بات کچھ معرض شبہ میں نہیں کہ غالب کی فارسی دانی کی بنیاد کیا تھی۔ لیکن اتمام حجت کے خیال سے آیئے ان کے اس دعوے کو ایک زاویۂ نگاہ سے بھی دیکھ لیا جائے :-

علم زباں دانی کے الہامی اور وجدانی ہونے کی ایک ہی دلیل ہوسکتی ہے کہ مدعی کا ہر ایک قیاس اور اجتہاد صحیح نکلے اور بغیر نظائر و امثال کی طرف رجوع ہوئے وہ صحیح فیصلہ کر سکے۔ اور پھر اس کے بعد کسی دلیل۔ سند۔ نظیر کی ضرورت نہ رہے۔ جو دلائل و نظائر دستیاب ہوں وہ اس کی موافقت ہی میں ملیں اور جو دو ایک اس کے خلاف ہوں وہ غلط ٹھیریں۔ اس کسوٹی پر اگر

۵۱؎ ادبی خطوط غالب صفحہ ۹۸

۵۲؎ " " " " ۵۹

کہا جائے تو مرزا کا الہام اکثر باطل ثابت ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں کئی مقام
ایسے ملتے ہیں جہاں انھوں نے کچھ اور لکھا تھا لیکن بعد میں کسی استاد کی
اصلاح یا دوست کی صلاح کے بعد ترمیم کر لی۔ اس کے علاوہ ایک جگہ
فرماتے ہیں :-

"لفظ (خم وچم) پیارا۔ مجھے بھی پسند۔ مگر کیا کروں جو اپنے پیشواؤں
سے نہ سنا ہو اس کو کیونکر صحیح جانوں [51]"

ایک اور جگہ فرمایا ہے :-

"میں کسی کلمے کا استعمال نہیں کرتا جب تک اہلِ زبان کے کلام
میں نہیں دیکھ لیتا [52]"

ایک جگہ اور لکھا ہے :-

"فقیر نے اساتذہ کے کلام میں کہیں یہ ترکیب نہیں دیکھی پس میں اس کی
صحت اور غلطی میں کلام نہیں کر سکتا [53]" گویا مبدا فیض کا دروازہ بند ہے
اور کلام اساتذہ سے مدد مانگی جارہی ہے۔ مختصر یہ کہ یہ چیز صاف ظاہر ہے
کہ مرزا غالب کی فارسی دانی کی بنیاد بھی وہی قدماء کا کلام اور تحریرات تھیں جن
سے اور سب نے بھی کسب فیض کیا ہے۔ ہاں اس میں مراتب ہیں۔ غالب
نے اس میں بہت جگہ پیدا کی تھی اور اسی مناسبت سے انھیں اس پر عبور بھی حاصل تھا۔

---

۵۱ ادبی خطوط غالب صفحہ ۱۷۲

۵۲ " " " " ۷۰

۵۳ " " " " ۱۰۱

کیا اور ہندوستانیوں کو صحیح فارسی آ ہی نہیں سکتی

تنقیح نمبر۱ میں یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ مرزا غالب کا علم فارسی بھی اسی طرح اکتسابی تھا جیسا کہ کسی اور کا ہو سکتا ہے۔ پھر جب وہ ہندی نژاد ہمیشہ کے ہندوستان میں رہنے والے اور ایسے زمانے میں رہنے والے جبکہ فارسی ذوق کا مرثیہ پڑھا جا چکا تھا فارسی زبان دانی کے ماہر ہو سکتے ہیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان کے وسیع ملک میں اللہ کی یہ رحمت کسی اور پر نازل نہیں ہو سکتی۔ اگر واقعی الہام اور وجدان بھی ہوتا تو بھی اس سوت کا سوکھ جانا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔
خود غالب کہتے ہیں ؎

ہر خوشے را خوشترے ہم بودہ است ٭ گر سرے ہست افسرے ہم بودہ است
مبدا، فیاض را مشمر بخیل ٭ نز می ریزد رطب از ان نخیل [۵۱]

ہاں یہ ممکن ہے کہ یہ دلیل اس وقت ہنوز کے لئے تھی جب ابوالفضل کے مقابلے میں اپنی انشاء کو بہتر ثابت کرنا تھا۔ اپنے مقابلے میں دوسروں کے لئے شاید اس دلیل کو ناقص سمجھتے تھے۔

اس کے علاوہ اس مسئلہ پر اہل الرائے حضرات کا فیصلہ سنئے :۔

صاحبِ غالب نامہ تو صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ "حقیقتاً یہ ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے جس پر آج بھی اہل الرائے متفق نہیں [۵۲]" لیکن حالی مرحوم نے اس مسئلہ پر واضح طور پر روشنی ڈالی ہے۔ یادگار غالب صفحہ ۲۱۷ پر فرماتے ہیں :۔

---

۵۱ تقریظ آئین اکبری۔ جو سرسید نے شامل کتاب نہیں کی۔

۵۲ غالب نامہ صفحہ ۹۴

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک زبان داں آدمی شاعری میں اہلِ زبان کے برابر ہو بھی سکتا ہے یا نہیں۔ سو شاعری کا ہنر دو مختلف لیاقتوں سے مرکب ہے۔ ایک اے جی نے شن یعنی قوتِ متخیلہ کی بلند پردازی دوسرے مناسب الفاظ کے استعمال پر قدرت۔ ان میں سے پہلی لیاقت جیسا کہ ظاہر ہے ممکن ہے ایک زباں داں بہ نسبت اہلِ زبان کے۔ ایک کم علم بہ نسبت فاضلِ تبحر کے اور ایک دیہاتی گنوار بہ نسبت خواص اہلِ شہر کے بمراتب افضل واعلیٰ درجے کی رکھتا ہو۔ دوسری لیاقت اگرچہ اہلِ زبان کے ساتھ مخصوص معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں بھی مثلاً ایک ہندی نژاد اکتساب کے ذریعہ سے خاصکر اس حصہ زبان میں جو فارسی کی محدود شاعری میں مستعمل ہے اہلِ ایران کی برابری کر سکتا ہے۔ علامہ ابنِ خلدون عربی زبان کے نسبت جو بمقابلہ فارسی کے نہایت وسیع زبان ہے لکھتے ہیں "ایک عجمی (یعنی غیر عربی) فصحائے عرب کی ممارست سے اہلِ زبان میں شمار ہو سکتا ہے۔"

سید انشاء اللہ خاں انشار دریائے لطافت میں فرماتے ہیں:-

"اس بحث سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ یہ بیانات اس امر کے مانع ہیں کہ جو شخص دوسری جگہ پیدا ہوا ہو ممکن ہے کہ لہجہ اور زبان اردو جیسا کہ چاہیئے سیکھ جائے اور اس کا تصرف لوگوں میں مقبول ہو۔ اور اس کے کلام کو مستند سمجھا جائے۔ کیوں کہ ذکی آدمی کا ہونا ہر جگہ ممکن ہے، اور ہر فنِ شریف کا حاصل ہونا یقینی امر ہے۔ ہاں شرط یہ ہے کہ اس میں پورے طور پر دل لگایا جائے۔ یہ بدیہی بات ہے کہ ایران سے اتنی دور رہ کر

کتابوں اور اہلِ زبان سے سیکھنے سے بڑے پایہ کے فارسی میں کہنے والے
شاعر ہندوستان میں ہو چکے ہیں[لہ]"

غالب نے زباندانی اور معانی آفرینی کے بیان میں خلط مبحث کر دیا

گویا یہ دعویٰ بھی غلط ٹھیرا کہ ہندوستانیوں کو صحیح فارسی آ ہی نہیں سکتی
یہ بات اور بطور جملہ معترضہ بیان کر دی جائے
کہ مرزا غالب نے شاعری کی ان دو مختلف
لیاقتوں کے بیان میں اکثر خلطِ مبحث کیا ہے۔ یا شاید وہ یہ بھی سمجھتے تھے
کہ ہندی نہ صرف زبان دانی میں ایرانیوں سے کم ہیں بلکہ معانی آفرینی میں بھی
مقابلتاً ہیچ و پوچ ہیں۔ فرماتے ہیں :-

" غالب کہتا ہے کہ ہندوستان کے سخنوروں میں حضرت امیر خسرو
دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے سوا کوئی استاد مسلم الثبوت نہیں ہوا .... خبر فیضی بھی
نغز گوئی میں مشہور ہے کلام اس کا پسندیدۂ جمہور ہے۔ دیکھو عبد القادر بدایونی لکھتا
ہے ' زہے سپاہیٔ فالہٗ '۔ آرزو فقیر رشید اور بہار وغیرہم نہی میں آ گئے۔
ناصر علی ' بیدل اور غنیمت ان کی فارسی کیا۔ ہر ایک کا کلام بہ نظرِ انصاف دیکھئے
ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ منت، منیر، واقف اور قتیل یہ تو اس قابل بھی نہیں کہ
ان کا نام لیجئے۔ ان حضرات میں عالم علوم عربیہ کے شخص ہیں۔ خیر ہوں۔
فاضل کہلائیں۔ کلام میں ان کے مزا کہاں۔ ایرانیوں کی سی ادا کہاں .....
مولوی احسان اللہ ممتاز کو صنائع لفظی میں دستگاہ اچھی تھی۔ اس شیوہ وروش
کو خوب برت گئے۔ فارسی وہ کیا جانیں۔ قاضی محمد صادق اختر عالم ہوں گے۔

لہ دیباچۂ لطائف صفحہ ۵۱، ۵۲

شاعری سے ان کو کیا علاقہ[51]"

پھر اسی قوتِ متخیلہ کی بلند پروازی کے متعلق فرمایا:-

"یہ چیز نہ حصے میں سب پارسیوں کے آئی ہے۔ اس اُردو زبان میں بعض اہلِ ہند نے بھی وہ چیز پائی ہے[52]"

یہ خوب منطق ہے کہ اہلِ ہند اُردو میں تو اس کے اہل ہوں اور فارسی میں نہیں۔ اصل میں یہاں مرزا معمول اور ضرورت سے زیادہ ایرانیت میں رنگے ہوئے ہیں۔ ورنہ وہ سنجیدہ لمحوں میں یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ "ہند کے شاعروں میں اچھے اچھے خوش گو اور معنی یاب ہیں۔ لیکن یہ کون احمق کہے گا کہ یہ لوگ دعویٰ زبان دانی کے باب ہیں[53]"

غالب کا بتایا ہوا معیار

بہر حال مرزا غالب نے "ہیچ مادیگرے نیست" اور "زمانہ جمع جہال است" کا فلسفہ بیان کرنے کے بعد فارسی کے کھرے کھوٹے پن کو پرکھنے کے لئے ایک معیار بھی بتا دیا۔ فرماتے ہیں:-

"میں اہل زبان کا پیرو اور ہندیوں میں سوائے امیر خسرو دہلوی کے سب کا منکر ہوں[54]۔ جب تک قدما یا متاخرین میں مثل صائب و کلیم و اسیر و حزیں

---

[51] ادبی خطوطِ غالب صفحہ ۸۴، ۸۵

[52] " " " ۸۸

[53] " " " ۱۱۵

[54] یہ بھی بڑی عنایت ہے۔ ورنہ ہندوستان جنت نشان میں تو ایسے جید عالم کی بھی کمی نہیں جو خسرو کے بھی منکر ہیں۔ حضرت جوش ملیح آبادی نے "یزدان و نگار" (باقی حاشیہ)

سے کلام میں کوئی لفظ یا ترکیب نہیں دیکھ لیتا اس کو نظم اور نثر میں نہیں لکھتا"[1]

اسی چیز کو دوسری طرح کہتے ہیں :-

"فقیر نے اساتذہ کے کلام میں کہیں یہ ترکیب نہیں دیکھی پس میں اس کی صحت اور غلطی میں کلام نہیں کر سکتا۔ جانب غلطی میرے نزدیک راجح ہے۔ آپ جب تک کلام اہلِ زبان میں نہ دیکھ لیں اس کو جائز نہ مانیے گا۔ مگر کلام سعدی و نظامی وحزیں اور ان کے امثال و نظائر کا معتمد علیہ ہے نہ آرزو اور واقف اور قتیل وغیرہم کا"[2]

یک جگہ فرمایا ہے :-

"غالب کہتا ہے کہ شعرائے ایران کلہم اجمعین مسلم الثبوت ہیں اور ان کا

(بقیہ صفحہ ۱۲۳) کی ترکیب استعمال کی۔ حضرت نیاز فتحپوری مدیر نگار نے اس کو غلط ٹھیرایا۔ اور سند مانگی۔ سند میں امیر خسروؒ کا یہ شعر پیش کیا گیا ؎

بہر بازی از نرگس پر خمار ✦ خدنگ افگنان و فرشتہ شکار (آئینہ سکندری)

نیاز صاحب نے اس سند کو ماننے سے صاف انکار کر دیا کہ یہ ہندی نژاد شاعر کی ہے ایرانی الاصل شاعر کی سند کے علاوہ کوئی سند درخورِ اعتنا نہیں۔ اس پر سب سے پہلے مولوی ابوالکمال صاحب آمیہ اٹھوی نے صائب کا یہ شعر پیش کیا ؎

بال پرواز ترا ہر چند صائب بستہ اند ✦ شکر للہ خاطرِ معنی شکارم دادہ اند

اور پھر حضرت عندلیب شادانی نے بھی قاآنی، سپہر کاشانی، قیصبائی، صباحی، کاشفی اور آتنی کے اشعار بھی سند آ پیش کئے جب نیاز صاحب مانے۔ اس معرکے کے لئے دیکھئے نگار ماہ مئی و جون سنہ ۱۹۲۶ء

[1] ادبی خطوط غالب صفحہ ۷۲ [2] ادبی خطوط غالب صفحہ ۱۰۵

کلام سند ہے۔ سخنوران ہند میں امیر خسرو دہلوی بھی ایسے ہی ہیں جیسے اہل ایران[۹۱]"

گویا انھوں نے کل ایرانی شعرار کو سند مانا ہے۔ چند کو خصوصیت سے نام بنام بھی گنوادیا ہے۔ جن میں بعض کا ذکر تو حسب بالا اقتباسات میں آیا۔ ان کے علاوہ حسب ذیل کا بھی خصوصیت سے ذکر کیا ہے:۔

"میرا خداوند نعمت نظامی علیہ الرحمۃ فرماتا ہے[۹۲]..."

"قالب معنی کی جان ہے ظہوری۔ ناطقہ کی سرفرازی کا نشان ہے ظہوری[۹۳]۔" وغیرہ وغیرہ

ہمیں فی الحال اس سے بحث نہیں کہ مرزا غالب کا بتایا ہوا یہ معیار ٹھیک بھی ہے یا نہیں۔ اس کو اس وقت صحیح مان کر بھی دیکھنا یہ ہے کہ اس معیار کے مرزا غالب خود ہی کہاں تک قائل تھے۔

ادبی خطوطِ غالب کے پہلے ہی خط میں مرزا غالب فرماتے ہیں:۔

"ان طبع موزوں رکھتا ہوں اور فارسی زبان سے لگاؤ رکھتا ہوں اور یہ بھی یاد رہے کہ فارسی کی ترکیب الفاظ اور فارسی اشعار کے معنی کی پرداز میں میرا قول اکثر خلاف جمہور پائیگا۔ اور حق بجانب میرے ہوگا۔"

اسی طرح بیش بیشتر کی بحث میں[۹۴] مرزا کا فیصلہ کچھ اور تھا۔ مرزا تفتہ نے

---

۹۱ ادبی خطوطِ غالب صفحہ ۱۸۵

۹۲ " " " " ۷۴

۹۳ " " " " ۸۴

۹۴ اس بحث کی تفصیل خطوط سے نہیں معلوم ہوتی۔

متعدد اساتذہ مسلم الثبوت کی اسناد سے دوسری بات ثابت کی۔ مرزا حسب عادت نہیں مانے۔ فرماتے ہیں :۔

"صاحب دیکھو پھر تم دنگا کرتے ہو۔ وہی ہٹش و بیشتر کا قصہ نکالا۔ غلطی میں جمہور کی پیروی کیا فرض ہے؟"[۵۱]

مرزا تفتہ نے ریمیا اور سیمیا کے متعلق دریافت کیا اور اساتذہ سلف کے اشعار لکھے کہ انھوں نے یہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔ مرزا غالب نے جواب دیا :۔

"بھائی ریمیا اور سیمیا خرافات ہے .... یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو لکھ گئے ہیں وہ حق ہے۔ کیا آگے آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے؟"[۵۲]

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :۔

"بڑی قباحت یہ ہے کہ اعم تشدید لفظ عربی ہے۔ ع دیگر نتواں گفت اخص را کہ اعم است۔ مگر بحر ادا ہو جاتی ہے۔ مانا کہ فارسی نویسان عجم نے یوں ہی لکھا ہو"[۵۳] یعنی پھر بھی منظور نہیں۔

لے لیجئے کہاں تو یہ زور تھا کہ اہلِ زبان میں سے کوئی بھی کچھ کہے وہ سند ہے یا جمہور کی بھی نہیں مانتے۔ حالانکہ جمہور کا کہا ہوا غلط ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر وہ قواعد کے خلاف بھی ہوگا تو مستثنیٰ سمجھا جائیگا ورنہ پھر امثال و نظائر بسیار

---

۵۱ ادبی خطوط غالب صفحہ ۱۶۷

۵۲ " " " " ۱۵۸

۵۳ " " " " ۱۶۰

چیز ثابت ہوتی ہے۔

اس عام فیصلہ کے علاوہ بھی انھوں نے تقریباً ہر اس شخص کی جس کو استاد بتایا ہے تحقیر و تحمیق کی ہے۔ یا اس کے خلاف اپنے قول کی افضلیت ظاہر کی ہے۔ اور ہندیوں کی جن کی سند کو قبول کرنے سے قطعی انکار کیا ہے بعض جگہ ان کی سند مان لی ہے۔ بایں صورت کہ وہ ان کے قول کے موافق ہو۔ سُنیئے:-

مرزا ہرگوپال تفتہ نے نظر شگفتن اور گوش شگفتن لکھا۔ غالب نے اعتراض کیا ہوگا۔ تفتہ نے ظہوری کی سند دی۔ اس پر فرماتے ہیں:-

"نظر شگفتن اور گوش شگفتن ہم نہیں جانتے۔ اگرچہ منشی ہرگوپال تفتہ اور مولانا نورالدین ظہوری نے لکھا ہو"[1]

علی حزیں کا ایک مطلع ہے ؎

زترکتازیٔ آن نازنین سوار ہنوز ؎ زسبزہ می دمد انگشت زینہار ہنوز

اسی مطلع پر غالب فرماتے ہیں:-

"حزیں کے اس مطلع میں واقعی ایک ہنوز زائد اور بیہودہ ہے۔ تتبع کے واسطے سند نہیں ہو سکتا۔ یہ غلط محض ہے۔ یہ سقم ہے۔ یہ عیب ہے۔ اس کی کون پیروی کرے گا۔ حزیں تو آدمی تھا یہ مطلع اگر جبریل کا ہوتا تو اس کو سند نہ جانو۔ اور اس کی پیروی نہ کرو"[2]

---

[1] ادبی خطوط غالب صفحہ ۱۴۴

[2] " " " " " ۱۴۵

مرزا صائب کے متعلق فرماتے ہیں :-

" صائب اگرچہ اصفہانی نژاد تھا مگر وارد شاہجہاں آباد تھا۔ انتقام کشیدن اور انتقام گرفتن دونوں بول گیا[۵۱] "

حالانکہ مرزا صائب بھی ان خوش قسمتوں میں سے تھے جن کو مرزا غالب نے اساتذۂ مسلم الثبوت میں سے گنوایا تھا۔ شاہجہاں آباد آنے کی ایک ہی ہوئی۔ اس طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ تو پھر اور بہت سے ایرانی شاعر مثلاً عرفی۔ سعدی۔ ظہوری وغیرہ بھی بھسنٹ ہو چکے ہیں۔

نظامی کے متعلق مرزا غالب کی رائے کو ہم غالب نامہ میں سے درج کرتے ہیں :-

" ساقی نامے میں انھوں (غالب) نے بے چارے نظامی کا مذاق اڑایا ہے .... لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا ساقی نامہ بہت پھیکا ہے[۵۲] "

خاقانی کے متعلق فرماتے ہیں :-

" اس نے (خاقانی نے) جناب امیرالمومنین کے واسطے ایک لفظ سہل سرسری لکھا میں نے قبول نہ کیا اور اس کے قول کا تنزل ظاہر کر دیا[۵۳] "

فیضی کے لئے ارشاد ہے :-

---

۵۱ ادبی خطوط غالب نامہ صفحہ ۸۶

۵۲ غالب نامہ صفحہ ۹۰

۵۳ "ادبی خطوط غالب صفحہ ۱۲۷

"میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹیک نکل جاتی ہے[۵۱]۔"

جمع الجمع "اَمال" کی مثال مرزا تفتہ نے کسی مسلم الثبوت استاد کے کلام سے دی اس پر لکھا ہے:۔

"یہ کھلی سوزش ہے ع۔ خطائے بزرگاں گرفتن خطا ست۔ ہم کو اپنی تہذیب سے کام ہے۔ اغلاط میں سند کیوں ڈھونڈتے پھریں مثلاً حضرت حافظ نے لکھا ہے ؎

صلاح کار کجا ومن خراب کجا ؛ بہ بین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا[۵۲]"

مرزا جلال اسیر کے متعلق فرمایا:۔

"مرزا جلال اسیر علیہ الرحمۃ مختار ہیں اور ان کا کلام سند ہے۔ میری کیا مجال کہ ان کے باندھے ہوئے لفظ کو غلط کہوں۔ لیکن تعجب ہے اور بہت تعجب ہے کہ امیر زادۂ ایران ایسا لفظ لکھے ...... 'بے پیر' ایک لفظ ٹکسال باہر ہے ورنہ صاحب زبان ہونے میں اسیر بھی ظہوری سے کم نہیں[۵۳]"

اہلی شیرازی کا شعر ہے ؎

بازآر دل خود از چنین کار ؛ آزار چہ می کنی دلم را

اس میں "آزار چہ میکنی" پر مرزا غالب نے اعتراض کیا ہے۔ کہتے ہیں:۔

---

۵۱ ادبی خطوط غالب صفحہ ۱۵۰

۵۲ " " " " ۱۴۷ ، ۱۴۸

۵۳ " " " " ۱۶۹

"انہی نے زبردستی کی ہے[۵۱]"

یہاں تک ایسی مثالیں جناب نے ملاحظہ فرمائیں جن میں مرزا غالب نے ان لوگوں سے انحراف کیا ہے جن کو وہ خود مسلم الثبوت کہہ چکے تھے۔ اب وہ بھی دو ایک دیکھ لیجئے جہاں اپنے مطلب کے لئے مرزا نے ایسوں کی سند مانی ہے جن کو وہ مستند علیہ نہیں سمجھتے تھے۔ اور اگر کوئی اور سند دیتا تو یقیناً رد کر دیتے:۔ فرماتے ہیں:۔

"اگر معترض فیضی کو نہیں مانتا تو آپ معترض کو کیوں مانتے ہیں۔ فیضی کی سند مقبول اور مسموع[۵۲]"

نواب انوارالدولہ نے دریافت کیا کہ ارنی کی "ر" ساکن ہے یا متحرک اس کے جواب میں مرزا غالب نے جو سند میں دو شعر پیش کئے ہیں ان میں سے ایک تو خود ان کا ہے اور دوسرا مرزا عبدالقادر بیدل جو دونوں فارسی نویسانِ ہند میں[۵۳]

مختصر یہ کہ خود ساختہ معیار کو خود ہی قدم قدم پر ڈھاتے جاتے ہیں۔ ابھی کچھ کہتے ہیں ابھی کچھ اور۔ گویا معیار دعیار کچھ نہیں۔ اصل معیار مرزا غالب کا قول ہے۔ اب جو جو اس سے متفق ہیں وہ سب مسلم الثبوت ورنہ نا قابلِ قبول۔

---

۵۱ ادبی خطوط غالب صفحہ ۱۶۹

۵۲ " " " " ۲۱۰

۵۳ " " " " ۹۰

مرزا قتیل کا بتایا ہوا معیار

مرزا غالب کا معیار آپ نے دیکھا۔ اصل میں انھوں نے اس کے قائم کرنے میں اصولی غلطی کی۔ یہ بات ہی شروع سے غلط ہے کہ ہر شخص انفرادی حیثیت سے بھی سند ہے بشرطیکہ وہ ایرانی ہے۔ اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ ایرانیوں میں آپس میں کوئی اختلاف ہی نہیں۔ ورنہ پھر دو متضاد سندوں میں کسی ایک کو صحیح ٹھیرانے کی کیا صورت ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک ضرور غلط ہوگی۔ یہی غلطی تھی جس کی وجہ سے مرزا غالب کو اپنے بنائے ہوئے معیار کو اتنی بار بگاڑنا پڑا۔ اب دیکھئے مرزا قتیل کیا معیار پیش کرتے ہیں۔ اور پھر اصابت رائے اور سلامت طبع کی داد دیجئے:۔

"در ذکر زبان فارسی میگویم کہ برائے مقلد شعر فارسیٔ ایران و توران ہر دو مستند است و از تورانیاں زبان آذربائیجان بہتر است۔ اہل خراسان از اہل آذربائیجان فصیح بمانند و شیرازیاں بہ از خراسانیاں و صفاہانیاں بہ از ہمہ واشراف و اجلاف و شہرے و کوہے ایران صاحب زبان اند۔ در وقت حرف زدن تلقیحی و مرزا صائب ہر دو برابر اند و زبان ہر دو سند۔ مگر بعضے اہل زبان مخرج بعضے حرف ندارند مانند ہندیان و در ہر فرقہ و ہر صنف یافتہ می شود کہ بعضے مخرج را ندارند۔ دریں صورت لفظے کہ از زبان اہل زبان برآید غلط باشد مثل قلطوم فیل بجائے خرطوم فیل۔ یا دیلفار بجائے دلوار و کاسے و ہٗ ئے بجائے کاروبار یا آوانشین بجائے آتشین یا شُتو بجائے شب و کلم بجائے قلم و نیز اگر از شعر لئے ایران خطا در بحر یا قافیہ ہم افتد ہم سند نہ باشد۔ و تصرف ایشاں در الفاظِ عربی بر وضع خود شاں و در الفاظ عجمی بطرزِ عرب صحیح بود مثل طلبیدن و فہمیدن و طعیدن در الفاظِ عربی و مانند مشدد و مزلف و مزیب و نزاکت و

غیر آن در الفاظ فارسی ۔ و نیز لفظے کہ چار شاعر عالی مرتبت استعمال نمودہ باشند سند باشد اگرچہ در اصل غلط بود ۔ یا دہ شاعر موزوں طبع ایران اتفاق بر آن نمایند یا علی العموم تلفظ بآن روا دارند" [1]

مرزا قتیل نے ہندی فارسی دانوں کی عام غلطیاں اور ان کی مخصوص طرز تحریر جو گو صحیح فارسی ہوتی ہے لیکن ایرانی فارسی سے مختلف ہوتی ہے ان سب کو بالتفصیل بیان کیا ہے ۔ پھر ایران کے مختلف حصوں کی مخصوص بولیوں کا بالتشریح ذکر ہے ۔ اس سے آگے صحیح تعلیم کی اہمیت بتائی ہے اور بتایا ہے کہ خواہ صحیح فارسی لکھنی آ جائے لیکن ایرانیت اسوقت تک نہیں آتی جب تک کم از کم یہ نہ ہو کہ کسی ایرانی سے فارسی حاصل کی جائے ۔ چار شربت میں بھی اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے ۔ ہندوستان کے بزعم خود اہل علم حضرات کے متعلق ارشاد ہوتا ہے :-

"کتب ایشان دیدنی است ۔ عربی و فارسی و یونانی و سریانی و انگریزی و پوربی و پنجابی و مارواڑی را یکجا ساختہ اند ۔ و ہمہ را بزعم خود محاورۂ اہل ایران

---

[1] نہر الفصاحت صفحہ ۱۴ ۔ منصف مزاج حضرات اس معیار کی جامعیت اور اس کے باوجود اختصار کی داد دیں گے ۔ مرزا غالب بھی اس قسم کے مناسب معیار کے قائل تھے لیکن صرف اُردو کے لئے ۔ فرماتے ہیں " اس امر کے مالک اور اہل زبان ہم ہیں ۔ اور یہ ہم صیغۂ متکلم مع الغیر ہے یعنی ہم اور تم اور مجموع شرفا اور شعراء دہلی و لکھنؤ ۔ ایسے دس آدمی کا اتفاق سند ہے ۔ زیادہ جھگڑا بے فائدہ " ادبی خطوط صفحہ ۲۱۷ ۔
خبر نہیں مرزا نے ایسا ہی کوئی معیار فارسی کے لئے کیوں نہ تجویز کیا ۔

تصور نمودہ اند۔ قطع نظر از ینکہ باغ زاغاں کہ در ہرات است آنرا اصفاہان بردہ اند و شکر درہ کہ در کابل است آنرا در قند ہار می جویند و بجائے حائے حطی جیم تازی خواندہ اند یا بالعکس۔ چہ سرا کہ در غوامض فارسی کہ از قلم بلاغت رقم ریختہ اند۔ ولائے بر مقلد بیچارہ۔ بعضے الفاظ را خود ہم تراشیدہ اند و در بعضے مصطلحات بعضے حسب دلخواہ داخل کردہ اند۔ و در بعضے مواقع کلمہ را بر کلمہ دیگر افزودہ مجموع را یک اصطلاح فہمیدہ اند مثل ماجرا آب بردن در یں شعر بمعنی کار عجیب و غریب کردن۔ شعر ؎

"غیر از برائے یار سمٹے تاب می برد ؎ ایں ماجرا بہ بیں چہ قدر آب می برد"[۵۱]

مرزا قتیل کی فارسی دانی

مختصر یہ کہ مرزا قتیل کی زندگی ہی فارسی زبان کی تعلیم و تعلم کے لئے وقف تھی۔ ان کو فارسی سے عشق تھا۔ اور اسی ذوق کی وجہ سے وہ مسلمان ہوئے اور اسی وجہ سے مذہب امامیہ اختیار کیا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں مرزا محمد باقر شہید اصفہانی کی تعلیم سے مسلمان ہوئے اور ان سے ہی فارسی کی درسیات پڑھیں۔ "استغنا بدرجۂ کمال تھا۔ بے سر و پا خانہ بدوش پھرتے تھے"[۵۲] اور اہل کمال سے جو مل سکتا تھا حاصل کرتے تھے۔ یہ تو خود غالب بھی مانتے ہیں کہ لکھنؤ میں جو ایرانی ادیب آتے رہتے تھے ان سے صحبتیں رہتی تھیں۔ یوں بھی غالب کی بہ نسبت پچاس برس پہلے کا زمانہ تھا اودھ کی حکومت نصف النہار پر تھی اور اس کے ساتھ فارسی بھی۔ غالب بھی

---

۵۱ چار شربت صفحہ ۵۲

۵۲ نگار جنوری ۱۹۳۹ء صفحہ ۲۴

مانتے ہیں کہ " وہ اہلِ ایران کی تقریر سے مشابہ تحریر بتاتا تھا " یا بالفاظِ دیگر مرزا قتیل اسوقت کی ایرانی زبان اور معاشرت سے خوب واقف تھے ۔ یہی نہیں بلکہ قدمار کا کلام بھی نہ صرف دیکھ رکھا تھا بلکہ مستحضر تھا ۔ مولوی امیر احمد صاحب علوی کاکوروی بی ۔ اے فرماتے ہیں :-

" قوت حافظہ لاجواب تھی ۔ تاریخ سلف برزبان ۔ عروض وقافیہ ۔ الہیات وریاضیات میں برق ۔ زبان فارسی پر عبور کامل " سلہ

اس کا ثبوت اور اس کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے کہ ان کی تصانیف ملاحظہ فرمائی جائیں ۔ شجرۃ الامانی ۔ نہر الفصاحت ۔ چار شربت ۔ رقعات وغیرہ دیکھے جا سکتے ہیں ۔ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ غالباً مرزا غالب نے قتیل کی کتابیں پڑھے بغیر ان پر اعتراضات وارد کر دئے ۔ ورنہ وہ دیکھتے کہ قتیل نہ صرف محاورۂ اہل ایران سے واقف ہے بلکہ ایران کے مختلف صوبوں اور حصوں کے مخصوص محاوروں اور وہاں کے اختلافات سے بھی کما حقہٗ آگاہی رکھتے تھے ۔ اور ان کی کتابوں کا بیشتر حصہ اسی میں صرف ہوا ہے کہ ہندیوں کو ہندی فارسی اور ایرانی فارسی کا فرق سمجھائیں ۔ پھر اس سب کے بعد اگر کوئی مرزا غالب سے یہ بھی کہے اور بتائے کہ قتیل صرف ہندوستان ہی میں ایرانیوں کی صحبت سے فیض یاب نہیں ہوئے تھے ۔ بلکہ خاکِ پاکِ ایران کی بھی برسوں کوچہ گردی کی تھی تو کیا ارشاد ہوگا ۔ سنئے مولوی عبدالحلیم صاحب شرر مرحوم کیا فرماتے ہیں :-

---

سلہ حیاتِ مصحفی از مولوی امیر احمد صاحب علوی کاکوروی بی اے ۔ نگار جنوری ۱۹۳۳ء

"لکھنؤ کے ابتدائی عروج میں ملاقاتی اور پھر مرزا قتیل کا نام مشہور ہوا جو ایک نومسلم فارسی دان تھے۔ خود مرزا قتیل مذاقاً کہا کرتے تھے کہ "بوئے کباب مرا مسلمان کرد" مگر سچ تو یہ ہے کہ فارسی کی تعلیم اس کے شوق اور کمال فارسی دانی کی آرزو نے انھیں مسلمان ہونے پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے محض اپنے شوق میں ایران کا سفر کیا۔ برسوں شیراز و اصفہان اور طہران و آذربائیجان کی خاک چھانی اور ادبِ فارسی کے اس کمال کو پہنچ گئے۔ کہ خود اہلِ زبان بھی ایسے باکمال زباں دان پر حسد کریں تو تعجب کی بات نہیں"۔

مرزا غالب نے جا بجا مرزا قتیل پر حملے کئے ہیں۔ بے شک مرزا غالب کا مذاقِ فارسی اعلیٰ درجہ کا تھا۔ اور وہ اس اصول پر بار بار زور دیتے تھے کہ سوا اہلِ زبان کے کسی کا کلام سند نہیں ہو سکتا مگر ان کے زمانے میں چونکہ ادھر سے بنگلے تک لوگ مرزا قتیل کے پیرو تھے اور بات بات میں مرزا قتیل کا نام لیا جاتا تھا۔ اس لئے مرزا غالب کو اکثر طیش آگیا۔ اور جب پیروانِ قتیل نے ان کی خبر لینی شروع کی تو وہ کہنے لگے ؎

فیض از صحبتِ قتیلم نیست ۔ رشک بر شہرتِ قتیلم نیست
مگر آنانکہ فارسی دانند ۔ ہم بریں رائے و عہد و پیماں اند
کز اہلِ زبان نہ بود قتیل ۔ ہرگز از اصفہان نہ بود قتیل
لاجرم اعتماد را نہ سزد ۔ گفتہ اش استناد را نہ سزد
کایں زباں خاص اہلِ ایران است ۔ مشکلِ ما و سہلِ ایران است
سخنست آشکار و پنہاں نیست ۔ دہلی و لکھنؤ ز ایران نیست

لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ قتیل نے فارسی دانی میں جو کوششیں

کی تھیں اور اس میں واقفیت و کمال حاصل کرنے میں جو زندگی صرف کی تھی وہ بالکل بیکار گئی۔ اس بات کو ماننے میں کسی کو عذر نہیں ہو سکتا کہ قتیل کا کوئی دعویٰ جب تک وہ اہل زبان کی سند نہ پیش کریں قابل تسلیم نہیں۔ اور نہ قتیل کے ذہن میں کبھی یہ خیال گذرا ہوگا۔ لیکن اس کی خصوصیت قتیل کے ساتھ نہیں ہے۔ ہندوستان کا کوئی شخص بجائے خود سند نہیں ہو سکتا۔ خود مرزا نوشہ غالب بھی فارسی کا کوئی محاورہ بغیر اہل عجم سے ثبوت پیش کئے ہوئے استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ ہندوستانی فارسی دانوں کا اگر کچھ وقار قائم ہو سکتا ہے تو صرف اس بنا پر کہ کلام فارسی میں ان کی نظر وسیع ہے اور ہر ہر لفظ کے صحیح استعمال سے واقف ہیں۔ اور اس حیثیت سے سچ پوچھئے تو غالب کے مقابلہ میں قتیل کا پایہ بہت بلند تھا۔ غالب زندگی بھر ہندوستان کی خاک چھانتے رہے اور اسی کے ساتھ طلب معاش میں سرگردان رہے۔ قتیل کو اطمینان کا زمانہ ملا تھا۔ اور مدتوں خاک پاک ایران میں رہ کر گاؤں گاؤں کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے تھے۔

بہرحال لکھنؤ کی فارسی دانی کا آغاز قتیل سے ہوا اور ان سے کچھ پہلے ملا فائق نے جن کا خاندان آگرہ سے آکر لکھنؤ میں بس گیا تھا ادب و انشاء فارسی اور فارسی نظم و نثر میں اعلیٰ درجہ کی بے نظیر کتابیں تصنیف کیں۔ فارسی گو اور فارسی دان ان سے پہلے بھی ہندوستان میں گذرے ہیں مگر فارسی دانی کے ساتھ زبان فارسی کے اصول و قواعد و ضوابط اور صرف و نحو کا مدوّن کرنے کا شوق پہلے پہل لکھنؤ ہی میں شروع ہوا۔ اور وہ انہی کے قلم سے ظاہر ہوا۔ ان کی کتابیں اگر سچ پوچھئے تو لاجواب ہ

ہے مثل ہیں"[۱]

زباندانی میں سماعی اور قیاسی علم کی بحث

زبان دانی کے متعلق اہل الرائے اور قابل قدر ہستیوں نے اظہار خیالات کے بعد خود میرا کچھ کہنا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے لیکن مرزا غالب نے جو ایک چیز پر اکثر زور دیا ہے اس کے متعلق کچھ اپنے خیالات پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں فرہنگ نویسوں کے متعلق مرزا کہتے ہیں :-

"قواعد فارسی کا رسالہ اہل زبان میں سے کس نے لکھا ہے اور ان ہوس پیشہ فرہنگ لکھنے والوں نے وہ رسالہ کس فاضل عجم سے پڑھا ہے۔ شیدائے ہندی سکروی نے حاجی محمد جان قدسی علیہ الرحمۃ کے ایک شعر پر اعتراض کیا ہے۔ مرزا جلالائے طباطبائی علیہ الرحمۃ نے شیدا کو خط لکھا ہے۔ سر آغاز خط کا ایک قطعہ جس میں صحرا و دریا قافیہ اور برساند ردیف ہے۔ شعر آخر کا مصرعہ ثانی یاد رہ گیا ع - یعنی بہاد یو مقوئی برساند ۔ خلاصہ مضمون خط یہ ہے کہ نہ تو صاحب زبان ہے نہ زبان دان ہے۔ یعنی مقلد اور کاسہ لیس اہل ایران ہے۔ حاجی محمد جان کو سند پکڑ تجھ سے کس نے کہا ہے کہ اس سے لڑ[۲] کیا تو نے نہیں سنا جو عرفی اور فیضی میں گفتگو ہوئی ہے۔

---

[۱] اقتباس از رسالہ دلگداز نمبر ۵ جلد ۱۷ بابت ماہ مئی ۱۹۱۵ء "ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" یہ مضمون مولانا شرر مرحوم نے دلگداز میں سلسلہ وار لکھا تھا جو جنوری ۱۹۱۴ء میں شروع ہوا اور ۱۹۱۵ء میں بھی جاری رہا۔ اس میں لکھنؤ کی حالت کا بہت کچھ مکمل بیان ہے۔

[۲] اعتراض کی نوعیت کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن عام طور پر اس قسم کے (باقی ص ۱۴۰ پر)

اور موتمن الدولہ شیخ ابوالفضل کے رد بر و ہوئی ہے ۔ لغات فارسی اور ترکیب الفاظ میں کلام تھا ۔ مولانا جمال الدین عرفی علیہ الرحمۃ نے کہا کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اور نطق سے آشنا ہو گیا ہوں اپنے گھر کی بڑھیوں سے لغات فارسی اور یہی ترکیبیں سنتا رہا ہوں فیضی بولا کہ جو کچھ تم نے گھر کی بڑھیوں سے سیکھا ہے وہ ہم نے خاقانی اور انوری سے اخذ کیا ہے ۔ حضرت عرفی نے فرمایا کہ تقصیر معاف خاقانی اور انوری کا ماخذ بھی تو منطق گھر کی پیر زالوں کا ہے"[۵۱]

آگے لکھا ہے :-

"دکنی (صاحب برہان قاطع) کے قیاس کی غلطی اگر نہ سب جگہ بلکہ بعض جگہ سچ جانتے ہو"[۵۲]

ایک اور جگہ لکھا ہے :-

"وارستہ سیالکوٹی نے خان آرزو کی تحقیق پر سو جگہ اعتراض کیا ہے اور ہر اعتراض بجا ہے ۔ بایں ہمہ وہ بھی جہاں اپنے قیاس پر جاتا ہے منہ کی کھاتا ہے"[۵۳]

(بقیہ گذشتہ) اور ایسے جواب اسی وقت دئے جاتے ہیں جب کوئی لاجواب ہو جائے ۔ اردو میں بھی اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے ۔ مولوی عبدالغفور نساخ نے میر انیس پر کئی اعتراض وارد کئے ۔ ناسخ کے شاگردوں میں سے بعض لکھنوی حضرات نے جواب دئے اور جہاں لاجواب ہو گئے وہاں یہی کہا کہ انیس جو کہیں وہی سند ہے ۔ بنگال والوں کو کیا حق ہے کہ اہل زبان پر اعتراض کریں ۔

۵۱ ادبی خطوط غالب صفحہ ۱۱۳ و ۱۱۴

۵۲ " " " " ۱۱۴

۵۳ " " " " ۸۴

مختصراً مرزا غالب کا دعویٰ ہے کہ علم زبان دانی غیر اہل زبان کے لئے محض سماعی حد تک درست ہے، قیاس کا اس میں گذر نہیں۔ اس دعویٰ کے صحیح ہونے میں مطلق شبہ نہیں، پہلے زبان بنی اور پھر قواعد۔ قواعد سے زبان نہیں بنتی۔ بلکہ زبان کے لئے ایسے قواعد بنائے جاتے ہیں جن کا اطلاق عام اور وسیع ہو۔ پھر اگر قاعدوں کے خلاف کوئی بات رہ جاتی ہے (اور ایسی بے شمار ہیں) تو ان کو غلط نہیں کہا جا سکتا بلکہ ان کو مستثنیات میں رکھا جاتا ہے۔ گویا قاعدے زبان کو منضبط کرنے کے لئے بنائے جاتے ہیں نہ کہ قیاس آرائی کے لئے۔ اور اسی لئے قیاس خواہ قاعدے کے موافق ہی کیوں نہ ہو اس وقت تک صحیح نہیں مانا جا سکتا جب تک کہ جمہور اہل زبان اس سے متفق نہ ہوں۔ لیکن مرزا غالب نے جو اپنے دعوے میں غیر اہل زبان کی قید لگائی ہے وہ نہ صرف غیر ضروری بلکہ غلط ہے۔ زبان تو ایسی چیز ہے کہ اہل زبان بھی محض قیاس پر مطلق نہیں چل سکتا۔ بلکہ صرف سماعی علم کی حد تک رہنا پڑتا ہے۔ اور یہی چیز اس کو اہل زبان بناتی ہے۔ اور غیر اہل زبان پر فوقیت دیتی ہے کہ اس کا سماعی علم اس قدر وسیع ہوتا ہے کہ اس کو قیاس آرائی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ کسی کو حق نہیں کہ قیاس کی بنا پر کسی لفظ کے نئے معنی یا کسی ترکیب کا نیا استعمال کر بیٹھے۔ اس میں اہل زبان اور زبان دان دونوں بالکل برابر ہیں۔ غلطی غلطی سمجھی جائے گی خواہ وہ اہل زبان کی قیاس آرائی کا نتیجہ ہو خواہ زبان داں کی۔ مثلاً۔ اردو میں ایک محاورہ ہے "دھک سے رہ جانا" غالباً اس مناسبت سے میر انیس نے "فق سے ہو جانا" قیاس کر لیا۔ ع

رنگِ رُخِ کفارِ عرب ہو گیا فق سے

اگرچہ یہ خدائے سخن کا قیاس ہے۔ لیکن قطعی غلط۔

یہ صحیح ہے کہ زندہ زبان کے لئے ضروری ہے کہ بڑھے اور وسیع ہو۔ اور اس کے لئے ضرورت ہے کہ نئے الفاظ۔ نئی تراکیب اور نئے اسلوب نکالے جائیں۔ یہ کام ان لوگوں کا ہے جن کا علم کامل اور مذاق سلیم ہوتا ہے۔ اس میں بھی اہلِ زبان اور زبان داں کی تخصیص نہیں۔ لیکن زبان کا معاملہ ایسا نہیں جیسا کہ کسی سائنس کا ہے کہ محقق نے نئی بات دریافت کی اس کا عقلی اور عملی ثبوت دیا اور وہ قابلِ قبول سمجھی گئی۔ یہاں صاحب ذوق اصحاب نئے نئے الفاظ و معانی ڈھالتے رہتے ہیں۔ اور ملک کے سامنے پیش کرتے رہتے ہیں۔ شروع شروع میں سب نئے لہٰذا غیر سندی اور قیاسی ہوتے ہیں۔ عام طور پر ان سب کی مخالفت بھی ہوتی ہے۔ لیکن زمانہ ان کی کسوٹی ہے۔ بعض سکّے چل جاتے ہیں اور کھرے سمجھے جانے لگتے ہیں۔ بعض کھوٹے کے کھوٹے رہتے ہیں اور ٹکسال باہر سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن جیسا عرض کیا گیا اس دار الضرب کے کارندوں کے لئے ملکی اور غیر ملکی کی تخصیص نہیں۔ صرف علم صحیح اور مذاق سلیم کی ضرورت ہے۔ بہر حال اس سے انکار کی گنجائش نہیں۔ کہ سماعی اور قیاسی قید اہلِ زبان اور زبان داں دونوں پر برابر ہے۔ اہلِ زبان کی یہ فوقیت ہے کہ اس کے سماعی علم کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ نہ صرف کتابوں اور استادوں سے زبان سیکھتا ہے بلکہ شروع ہی سے گھر اور باہر وہی زبان اور اس کے محاورے سنتا اور سیکھتا ہے زبان داں کا زیادہ تر استادوں اور ان کی کتابوں پر دار و مدار ہوتا ہے۔ نوعیت ایک ہی ہے وسعت میں فرق ہے۔ پھر اگر اس میں کوئی زبان داں برسوں اہلِ زبان کے ملک میں جا کر رہے اور اس نیت اور ارادہ سے رہے کہ وہاں

کی زبان اور محاورے پر ہزار کوشش حاصل کرے۔ ہر وقت اس تلاش اور جستجو میں رہے کہ وہاں کے اسالیب بیان۔ طرز اظہار، الفاظ و معانی وہاں کے مستند علما و ادبا سے حاصل کرے تو ظاہر ہے کہ ایسے شخص کا رتبہ زبان میں بھی ایک عام اہلِ زبان سے بہت بلند ہوگا۔

ہندوستان میں فارسی دانی کے دعوے اور اس پر حیص بیص کچھ عجب بے معنی سی بات ہے۔ خصوصاً ان لوگوں کے لئے جنھوں نے نہ ایران دیکھا نہ وہاں کی زندگی سے آشنا اس زبان میں معمولی بات چیت نہ کر سکیں خط لکھنے میں تکلف ہو۔ وہاں کے ادب موجودہ اور ارتقائے زبان سے مطلق واقفیت نہ ہو لیکن زور شور یہ کہ یہ صحیح اور وہ غلط۔ کسی غیر زبان میں صحت اور عدم صحت اور اس سے بھی زیادہ بندش کی نزاکت اور ترکیب کی شیرینی کے متعلق بھلا کوئی غیر اہلِ زبان کیا کہہ سکتا ہے۔ کجا کہ لکھ سکے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ جو قدما کہہ گئے ہیں ان کی نقل ہو۔ سو اس میں نئی بات اور نزاکت کیا ہوئی اگر نئی بات کہیں گے تو قیاس پر دار و مدار ہوگا جو خواہ ٹھیک ہی ہو لیکن اس پر اعتبار ہی کیا جب تک اہلِ زبان اس کو نہ مانیں سو اس کا امکان نہیں۔ اہلِ زبان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ "گاؤ آمد و خر رفت" زبان میں الہام یا وجدان سب بے معنی چیز ہے۔ خود ہی اپنے منہ میاں مٹھو بن کر اگر جی خوش ہوتا ہے تو خیر ورنہ اور تو ہمارے بلند آہنگ دعووں کا کوئی مصرف معلوم نہیں ہوتا۔ غالب ہی کو لے لیجئے۔ وہ ان کا فارسی دیوان جو الہام سے بھی کچھ بڑھ کر ہے وہ کہاں ہے۔ ہندوستان تباہ و برباد سہی۔ مانا کہ یہاں فارسی ذوق مردہ ہوگیا لیکن ایران کو کیا ہوا۔ وہاں تو اب تک فارسی ہی زبان رائج ہے۔ زندہ قوم ہے

ہر طرح مرزا غالب کی پسندیدہ۔ وہاں کیوں نہ مرزا غالب کے دیوان فارسی کو پوچھا گیا۔ آخر ۱۹۴۳ء میں جناب آغا سید محمد اشرف صاحب ایم۔ اے پروفیسر فارسی کرنل براؤن پبلک سکول۔ ڈیرہ دون۔ ایران کی سیاحت سے واپس تشریف لائے ہیں۔ فرماتے تھے کہ ایران میں غالب یا ان کے دیوان کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ یہ بھی نہیں کہ ملک کی موجودہ ترقی کی وجہ سے شعر و شاعری اور خصوصاً پرانے زمانے کی شاعری سے ان لوگوں کو کوئی لگاؤ اب نہیں رہا ہے۔ آغا صاحب موصوف فرماتے تھے کہ حافظ و دیگر فارسی شعراء کو اسی ذوق و شوق اور فریفتگی سے پڑھا جاتا ہے جیسا کہ ہمیشہ سے ہے۔

غالب کی نثر تو نظم سے بھی کم اچھی سمجھی گئی۔ شیخ محمد اکرام صاحب فرماتے ہیں:-

اس میں شک نہیں کہ خواہ مرزا خود کچھ کہیں۔ انہوں نے نثر میں اکثر ان فارسی نثر نویسوں کا اتباع کیا ہے۔ جن کی تصنیفات بیشتر ہندوستان میں لکھی گئیں۔ اور اس امر پر قریباً قریباً سبھی فارسی اہلِ زبان متفق ہیں کہ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر ترکی یا مغل بادشاہوں کی سرپرستی میں جو فارسی کتابیں لکھی گئیں ان کا طرزِ تحریر بھی کسی طرح قابلِ تقلید نہیں[۱]،،

یہ ہے گویا غالب کی نظم و نثر پر اہلِ ایران کا فیصلہ

حاصلِ کلام | قصہ تو بہر حال مرزا قتیل کا تھا۔ آخر میں اس تمام بحث کا یہ نتیجہ نکالنا میرے نزدیک غلط نہیں کہ صرف " خاک نبود " کی بدعت کے علاوہ مرزا غالب

---

[۱] غالب نامہ صفحہ ۵۴

کوشش خواہش اور کاوش کے باوجود بھی مرزا قتیل کے کلام میں کوئی غلطی نہ نکال سکے
خطا اور سہو ماسوائے نبی ہر انسان کے خمیر میں ہے۔ اور انسانیت کی صف
سے تو مرزا غالب بھی خارج نہیں۔ متقدمین ہوں یا متاخرین سب کے کلام
میں خطا اور سہو کی مثالیں ملتی ہیں۔ پھر بے چارے مرزا قتیل بلکہ انکی ساری
پیڑھی کو ایک سہو کی سزا میں الٹ کر رکھ دینا۔ شرمناک گالیاں اور عریاں
صلواتیں سنانا۔ تذلیل وتحقیر کرنا اور پھر اس پر بغلیں بجانا۔ کہاں کا انصاف
اور کیسی تہذیب ہے۔ یہاں افسوس کے ساتھ یہ لکھنا پڑتا ہے کہ مرزا غالب
نے اس قسم کے متعصبانہ اور متبذل رویہ سے کچھ اپنی ہی توقیر میں کمی کرلی۔ مرزا
قتیل تو ان گالیوں سے زندہ ہو گئے ؎ قتیل

از نام بدم گفتی قربانِ زبانِ تو ؎ دشنام بمن دادی شکر بدہانِ تو

خاتمہ یہ مختصر سا رسالہ نذر ناظرین کرتے ہوئے میں خائف بھی ہوں کہ
اس میں بہت سی سخن گسترانہ باتیں آ پڑی ہیں۔ رائے کی یہ آزادی اکثروں کو
بالکل نہ بھائے گی۔ اور پرستارانِ غالب ممکن ہے وہ کچھ کہیں کہ ع اٹھائے
نہ اٹھے اور بنائے نہ بنے۔ ہمارے ہاں علمی بحث عموماً فوراً ہی ذاتیات
میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جس کا جواب خاموشی کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔
ایسے حضرات کی آسانی کے خاطر میں خود ہی بصدقِ دل اپنی کم مائیگی بے علمی
اور بے بضاعتی کا اقرار کئے لیتا ہوں۔ اور یہ محض برائے بیت نہیں۔ بلکہ جیسا کہ میں
نے عرض کیا، بالکل بصدقِ دل دبسلامتیٔ ہوش و حواس۔

آخر میں ایک بات پھر عرض کردوں۔ کہ اس بحث کا مطلب یہ ہرگز
نہیں کہ مرزا غالب کی اہمیت یا علمیت میں مجھے کلام ہے۔ مجھ ان کی منتخب

اُردو شاعری کے بے مثل اور انمول ہونے کا اعتراف ہے۔ میں ان کے ایک ایک منتخب شعر کا گرویدہ ہوں۔ مختصر یہ کہ میرے دل میں مرزا غالب کی اُردو شاعری اور اُردو رقعہ نگاری کی ایسی ہی اور اتنی ہی قدر ہے جتنی کہ شاید کسی بھی غالب کے شیدائی کو ہو۔ یعنی میں ان کے منتخب اُردو کلام کو الہامی ماننے کے لئے تیار ہوں ہاں خود ان کو نبی ماننے میں مجھے کلام ہے۔

فضلی سنز کی معیاری مطبوعات

مطلوب الطالبین	(سوانح)	مترجم لطیف اللہ خان	200/- روپے
ناممکن کی جستجو	(خودنوشت)	حمید نسیم	300/- روپے
ماضی کے تعاقب میں	(خودنوشت)	یونس احمر	90/- روپے
سُر کی تلاش	(خودنوشت)	لطف اللہ خان	200/- روپے
میرا کوئی ماضی نہیں	(خاکے)	سہاب قزلباش	120/- روپے
ستاروں کی چال	(افسانے)	ابوالفضل صدیقی	120/- روپے
گلابِ خاص	(افسانے)	ابوالفضل صدیقی	120/- روپے
زخمِ دل	(ناول)	ابوالفضل صدیقی	120/- روپے
تنہائی کا سفر	(افسانے)	تصدق سہیل	100/- روپے
میں شاخ سے کیوں ٹوٹا	(افسانے)	ڈاکٹر آصف فرخی	100/- روپے
دل کی وہی تنہائی	(افسانے)	ڈاکٹر شیر شاہ سید	120/- روپے
رُکے ہوئے ساون	(گیت)	اسد محمد خان	40/- روپے
ذلتوں کے اسیر	(ناول)	انورسن رائے	160/- روپے
حکایاتِ خونچکاں	(صحافت)	ضمیر نیازی	80/- روپے
دلّی دور ہے	(سفرنامہ)	قمر علی عباسی	250/- روپے
جاناں سویٹزرلینڈ	(سفرنامہ)	قمر علی عباسی	120/- روپے
واہ ! برطانیہ	(سفرنامہ)	قمر علی عباسی	70/- روپے
جست	(شاعری)	رضی اختر شوق	120/- روپے
سارے کام ضروری تھے	(شاعری)	حارث خلیق	50/- روپے
بچے تتلی پھول	(شاعری)	ن۔م۔دانش	80/- روپے
دیوانِ غالب	(پاکٹ سائز)	اسداللہ خاں غالب	100/- روپے